تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال

معید الظفر

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر

تہذیبی تصادم

اور

فکرِ اقبال

معید الظفر

اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر سرینگر

تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال

مُعید الظّفر

ⓒ اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر سرینگر
طبع اوّل: ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

مطبع: شالیمار آرٹ پریس سرینگر
کمپوٹر کمپوزنگ: ضمیر احمد
قیمت: ۲۰۰ روپے

انتساب

محترم ومکرم سید سجاد احمد اندرابی حفظہ اللہ

کے نام

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز*

مُعید الظّفر

---

* کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۸۹۔

فہرس

ا۔ انتساب

ب۔ حرفِ تحسین — پروفیسر بشیر احمد نحوی — ا

ج۔ تبریک — پروفیسر عبدالحق — ج

د۔ مقدمہ — معید الظفر — ز

☆ باب اوّل

۱۔ تہذیبی تصادم کیا ہے؟ — ۱

۲۔ ثقافت اور تہذیب — ۷

۳۔ تہذیبوں کے عروج وزوال کے اسباب — ۱۴

۴۔ حواشی — ۱۹

☆ باب دوم

۱۔ مغربی تہذیب-تاریخ کے آئینے میں — ۲۳

۲۔ مغربی تہذیب کی یلغار — ۲۸

۳۔ مغرب کے عروج کے اسباب اور اس کے نتائج — ۳۵

۴۔ حواشی — ۴۵

☆ باب سوم

۱۔ مغربی تہذیب اور موجودہ سیاسی صورت حال — ۴۷

۲۔ مغربی تہذیب کے جدید اور تہذیب کش عناصر — ۶۳

ا۔ ذرائع ابلاغ — ۶۷

ب۔ انسانی حقوق — ۷۱

ج۔ وطن پرستی — ۷۳

د۔ غیر مذہبیت — ۷۵

۵۔ جمہوریت ۷۸

۶۔ تعلیم ۸۱

۳۔ نیا عالمی نظام ۸۴

۴۔ حواشی ۹۰

☆ باب چہارم

۱۔ مغربی تہذیب کے خلاف مشرق کی جوابی تحریکات ۹۳

ا۔ تحریکِ کمالیت ۹۴

ب۔ تحریکِ استرداد ۹۷

ج۔ تحریکِ اصلاح ۹۹

۲۔ حواشی ۱۰۲

☆ باب پنجم

۱۔ مغربی تہذیب فکرِ اقبال کے آئینے میں ۱۰۳

۲۔ اقبال کا نظریۂ ردوقبول۔ مغربی تہذیب کے حوالہ سے ۱۱۷

۳۔ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کے تہذیب کش عناصر ۱۲۱

۴۔ اقبال کا مغربی تہذیب کے خلاف ردِ عمل ۱۲۵

۵۔ حواشی ۱۲۹

☆ باب ششم

۱۔ حاصل بحث

کیا تہذیبوں کے درمیان تصادم ہے؟ ۱۳۳

۲۔ حواشی ۱۴۷

☆ جدول ونقشہ جات اور تصاویر

۱۔ سموئیل ہنٹنگٹن کا موجودہ دنیا کے بارے میں ''تہذیبی'' نظریہ

[مقابل صفحہ نمبر ۲]

۲۔ تہذیبوں کی عالمی سیاست اور اُبھرتی صف بندی ہنٹنگٹن کی نظر میں

[مقابل صفحہ نمبر ۴]

۳۔ مغربی تہذیب کے بنیادی ادارہ جات اور اجزاء

[مقابل صفحہ نمبر ۲۶]

۴۔ مسجدِ قرطبہ-اسلامی اسپین (اندلس) کی پہچان

[مقابل صفحہ نمبر ۳۲]

۵۔ مسجدِ اقصیٰ-اسرائیلی (یہودی) نرغے میں

[مقابل صفحہ نمبر ۴۴]

۶۔ اسلامی علوم اور ثقافت کے چند اہم مراکز

[مقابل صفحہ نمبر ۱۳۶].

☆ ماخذ

حرفِ تحسین

عزیز القدر مُعیدُ الظّفر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں کچھ وقت تک بحیثیت ٹیچنگ اسسٹنٹ جس حسن وخوبی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے رہے، میں ذاتی طور پر ان کے کام سے بے حد متاثر رہا اور تقرری کے موقع پر میں نے جو علمی کام سرانجام دینے کی بات ان سے کہی تھی، اس پر صحیح معنوں میں عمل کرتے ہوئے معید صاحب نے ''تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال'' کے اہم موضوع پر ایک وقیع اور پُر مغز مقالہ تیار کیا جو خدا کے فضل وکرم سے آج کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

اقبال مغرب کے فکری اور علمی سرچشموں سے براہِ راست فیضیاب ہو چکے تھے۔ ایک سو سال پہلے وہ یورپ کی دانشوری کے مسائل اور امکانات سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور انہوں نے تب یہ پیش گوئی کی تھی کہ مغرب کی تہذیب اپنے خنجر سے خودکشی کے ذرائع پیدا کرے گی اور شاخِ نازک پر جو آشیانہ تعمیر ہوگا وہ بہر حال اپنی ناپائیداری کے سبب گر کر تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ اقبال کی مومنانہ فراست محسوس کر رہی تھی کہ جدید یورپی تہذیب اپنی تمام تابناکیوں اور ظاہری خوبیوں کے باوصف اخلاقی، روحانی اور ثقافتی اقدار کی دولت وثروت سے محروم ہوتی جارہی ہے اور یہی محرومی ایک عہد میں اس کی ہلاکت کا موجب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ مادی ترقی اور تکنیکی پیش رفت کے اعتبار سے بہت آگے جاچکا ہے لیکن صالح قدروں کی اہمیت مشینی کروفر کے سامنے مٹتی جارہی ہے۔ چنانچہ مغرب کے اندرون کو جب گہرائی سے دیکھا جاتا ہے تو وہاں ارتعاش، بے چینی، آوارگی اور بے حیائی کے تمام مظاہر موجود ہیں جو اس تہذیب کو مٹانے کے لئے کافی ہیں۔

عزیزی معید الظفر نے دلائل و شوائد کی بنیاد پر مغرب اور اسلام کے درمیان ''تصادم'' کا ایک متوازن مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس مطالعہ کی پشت پر مشرقی اور مغربی مفکرین کی آراء کارفرما ہیں۔ توقع ہے کہ فاضل مصنف کی کوششوں کو سراہا جائے گا اور عوام و خواص میں اس کتاب کو قبولیت حاصل ہوگی۔

بشیر احمد نحوی*

۱۱ نومبر ۲۰۰۴ء

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

---

* پروفیسر بشیر احمد نحوی اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر کے ڈائریکٹر اور برصغیر کے چنندہ اقبالیاتی اسکالروں میں شمار ہوتے ہیں۔

تبریک

ایک اہم دستاویز کی اشاعت پر میں پروفیسر بشیر احمد نحوی - ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ - کے حسنِ اہتمام کو آفرین کہتا ہوں جس کی ترتیب کے لئے جناب معید الظفر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے عصرِ حاضر کے ایک اندوہ ناک آمرانہ نظریہ کو موضوعِ سخن کے طور پر منتخب کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک فکری فساد کی صورت اختیار کر چکا ہے اور تیسری دنیا کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن کر اُبھرا ہے۔ بدقسمتی سے اسے عملی طور پر آزمایا بھی جانے لگا ہے۔

ایک تہذیب کو کرۂ ارض کی تمام تہذیبوں کو نابود کرنے کی اجارہ داری کا استعماری جواز حاصل ہو گیا ہے۔ دنیا کی دوسری تہذیبیں منتشر اور معدوم اکائیوں میں منقسم ہیں اور مسابقت و مقاومت ایک مزعومہ آفاقی تہذیب سے ہے جو صدیوں سے نو آبادیاتی نظام کے بہروپ میں جرأت آزمائی کرتا رہا ہے جسے بیسویں صدی کی ایشیائی بیداری نے ان کے وجود کو مشتبہ بنا دیا وہ نظام پے بہ پے شکست خوردگی کے بعد بدلے ہوئے حالات میں نئے کابوس کی صورت سوار ہو کر انتقام کی تدبیریں ایجاد کر رہا ہے۔ خاص طور پر زوالِ روس کے بعد امریکہ عیسائی تہذیب کا محافظ و معاون بن کر پوری انسانیت کو باور کرا رہا ہے کہ اب چار دانگِ عالم میں ایک حاکم کی حکمرانی ہو گی باقی سب مرگِ مفاجات ہیں۔ یہ ایک تہذیبی برتری کا اعلانیہ اور سیاسی فریب کا یلغار ہے جو اقتصادی تعاون اور فوجی تحفظ کے نام پر سب کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ مشرق کی تمام تہذیبیں اپنے بود و نود کے اندیشوں سے سراسیمہ ہیں۔ ایک نئی تہذیبی آویزش کا آدرش مغرب کی فسوں ساز حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ انہیں

یقین ہوگیا ہے کہ دوسری تہذیبیں خس وخاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

صرف اسلام ہے جو ان کے منصوبوں کو خوار وزبوں کرسکتا ہے۔ لہٰذا یہ تصادم اسلام اور عیسائیت کے درمیان ہے۔ شکست کی صلیب اب ان کے گردنوں میں طوقِ رسوائی بن کر ستا رہی ہے۔ بدقسمتی سے عالمِ اسلام پر ایک مشکل وقت آن پڑا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عیسائیت کے ساتھ صیہونیت اور ابنائے وطن کے فاشتی اتحادِ فکر وعمل کے منصوبے ہماری ثقافت کو ہدف بنا کر ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔

سموئیل ہنٹنگٹن نے بہت ہی واشگاف طور پر لکھا ہے کہ دوسری تہذیبوں کے برخلاف مقابلہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان ہے۔ یہ جنگ دست بدست بھی ہے اور فکر ونظر کی سطح پر بھی جاری ہے۔ بیسویں صدی میں عالمی شہرت رکھنے والے تہذیبی مورخ ٹوین بی نے تہذیبوں کے عروج وزوال کے تجزیے میں یہ علمی نکتہ برآمد کیا تھا کہ تہذیبی تصادم میں وہی تہذیب غالب ہوتی ہے جو تابِ مقاومت میں مقابل تہذیب پر سبقت حاصل کرتی ہو یعنی Challenge کا مردانہ وار response پیش کرتی ہو۔ مغرب یعنی امریکہ کو اس نظریہ کو بروئے کار لانے کا سنہرا موقع مل گیا ہے۔ اب تمام ممالک بڑے آقا کے حضور سرنگوں ہیں۔ کیونکہ جائے اماں اب امریکہ کے آغوش میں ہی حاصل ہے۔ عیسائیت بنام مغرب کی سربراہی اب امریکہ کے سر ہے۔ اس منصوبے کی راہ میں مزاحمت صرف مسلمانوں سے ہی ممکن ہے۔ اس منصوبے کی راہ میں مزاحمت صرف مسلمانوں سے ہی ممکن ہے۔ روس وچین اور ہندوستان امریکہ کی سیاسی کارگہی کے سامنے دم بخود ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ مزاحمت کی اس یقینی صورتِ حال کا دانایانِ فرنگ کو خوب اندازہ ہے۔ اس لئے حرب وضرب کے تمام وسیلے آزمائے جارہے ہیں۔

ہماری تاریخ میں علامہ ابن خلدون نے تاریخ وتہذیب کے مسائل پر سب سے پہلے قلم اٹھایا تھا۔ بیسویں صدی میں اشپنگلر نے ''زوالِ مغرب'' لکھ کر ایک نئے باب کی بشارت دی تھی۔ علامہ اقبال نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا۔ اس منظرنامے نے ان کی

بصیرت کو آمادہ کیا تھا کہ وہ ہمیں آگاہ کر سکیں۔ ان کی تحریروں میں تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور ترویج میں بڑے ہی خیال افروز نکات موجود ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے مسلم تہذیب کے تار و پود کو مزید مستحکم کرنے کی بے پایاں خواہشات کا ہم سے مطالبہ بھی کیا ہے۔ جسے ہم نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ان کا قول ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تہذیبی اکائی بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے مضطرب رہتی ہے اور بڑی تہذیب میں مدغم نہیں ہونا چاہتی بلکہ اس سے برسرِ پیکار رہتی ہے لہٰذا ہر تہذیب کو یکساں طور پر پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔

میں مطمئن ہوں کہ جناب معید الظفر نے مغربی منصوبوں کی قبا چاک کر کے بے پردہ دیدنی کو پوری کتاب میں علمی انداز میں پیش کر کے ایک بڑی خدمت کی ہے اور وقت کی اہم ضرورت پوری کی ہے۔ ان کا علمی اور تجزیاتی اسلوب بڑی دل کشی رکھتا ہے۔ مصنف نے سنجیدگی اور شناوری کے اعلیٰ اقدار کو اپنا کر نئے امکان کی دریابی بھی کی ہے۔ علامہ کے افکار کو اس تہذیبی تصادم کے سیاق میں سمجھنے کی انہیں جو توفیق ملی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اقبال شناسی کی اس نئی جہت نے علامہ کے افکار کو ہر دور کے لئے جو دائمی حیثیت دی ہے وہ ان کی ناگزیری ہے اور ہماری مجبوری۔ راقم مصنف کی علمی سرگرمیوں کا معترف ہے اور قدر شناس بھی۔

عبدالحق*

۲۰ ستمبر ۲۰۰۴ء

---

* پروفیسر عبدالحق دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ اس وقت وہ اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر (Visiting Professor) کام کر رہے ہیں۔

مُقدّمہ

الحمدللّٰہ رب العالمین، والصّلوٰۃ والسلام علی نبیہ الصادق الامین

انسانی تاریخ انسانی تہذیب کا ایک ایسا جزء لاینفک ہے جس کا مطالعہ اور پاس کرنا انسانی تہذیب کی بنیاد اور ارتقاء کے تفہیم کے لئے اشد ضروری ہے۔ تاریخ کے بغیر انسانی تہذیب ایک مذاق بن کر رہ جائے گی جس کی ابتداء اور ارتقاء کے منازل کے بارے میں معلومات مبہم اور نامکمل نظر آئیں گے۔ اگر ایک انسانی تہذیب کو اپنے تاریخی پس منظر سے جدا کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ انسانی تہذیب ہر وقت نئی اور اجنبی نظر آئے گی اور اس کی جڑیں، جو کہ ماضی میں پیوست ہوتی ہیں، آنکھوں سے اوجھل رہ جائیں گی۔ اسی طرح تہذیبوں سے وابستہ مسائل کا صحیح ادراک تب تک ناممکن ہے جب تک نہ ہم ان مسائل سے جڑی تہذیبوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں۔

عصرِ حاضر میں جو تہذیبی مسائل پوری دنیا کو درپیش ہیں، مغرب ان تمام مسائل کو ان کے ماضی اور ان کی تاریخ سے الگ کر کے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور ان قدیم مسائل۔ جن کی جڑیں ماضی میں دور تک پیوست ہیں۔ کو مغربی تہذیب سے وابستہ ممالک جدید تناظر میں سطحی طور پر سمجھنے اور پھر ''حل'' کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جس سے یہ مسائل نہ تو حل ہوتے ہیں اور نہ ان مسائل کا صحیح ادراک ایک آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ محفوظ اور برحق مستقبل کا وجود تب تک ناممکن ہے جب تک نہ ماضی کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے اور ماضی کے ساتھ ایک ایسا تسلسل قائم کیا جائے جس سے مسائل مجرد نہیں بلکہ باوجہ دکھائی دیں اور ان ہی وجوہات کی تہہ میں جا کر ان مسائل کا اصل حل ممکن ہو سکتا ہے۔

عالم اسلام میں جو بھی مسائل برپا ہیں وہ محض امن وامان کی ابتری، حقوق وفرائض کی پامالی یا قانون وجمہوریت کی ریغمالی نہیں ہیں بلکہ یہ تمام مسائل تاریخ سے جڑے ہوئے ہیں اور ان تمام مسائل کا منصفانہ حل تب تک ناممکن ہے جب تک نہ ان کی تاریخ اور ان کے پس منظر میں جھانکنے کی کوشش کی جائے۔ فلسطین محض غزہ میں ہورہی قتل وغارت کا مسئلہ نہیں اور نہ عراق صرف صدام کے "قہر" کے انہدام کا مطالبہ کررہا تھا۔ افغانستان، پاکستان، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا اور دیگر مسلم ممالک میں ہورہی تباہی صرف ان علاقہ جات میں آباد افراد سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ تمام مسائل اسلامی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کا حل بھی اسی تہذیب کے موافق ہونا ایک فطری تقاضا بھی ہے۔

موجودہ دور میں مغرب اور اس کے ہم نوا کسی بھی مسئلہ کو پہلے ہوا دیتے ہیں۔ مسئلہ پیدا کرکے پھر اُبھارا جاتا ہے اور اس کے بعد اپنی دخل اندازی سے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اپنی مفادات کو حاصل کرنے کے لئے اس مسئلہ کی تاریخی حیثیت کو مسخ کرکے اس کو ایک "مجرد مسئلہ" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور پھر اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد اس کو بتدریج کھوکھلا کرکے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح دوسرے غیر مغرب مگر غیر مسلم ممالک بھی اس ماڈل کو اپنا کر مسلمانوں کا قتل عام کرکے الزام بھی انہیں کے سر تھوپ کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی تگ ودو میں ہیں۔ اس طرح اسلامی تہذیب مظلوم بھی اور بدنام بھی بنائی جارہی ہے۔

اسلامی تہذیب قرآن کے اردگرد گھومتی ہے اور قرآن کا مرکزی نقطہ "عقیدۂ توحید" ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا مرکزی نقطہ عقیدۂ توحید ہی ہے۔ غرض ان تین۔ قرآن، توحید اور اسلامی تہذیب۔ کو ایک دوسرے سے الگ کرنا قطعاً ممکن نہیں۔ اسلامی تہذیب قرآن کی تولید اور پیداوار ہے اور قرآن کی بالادستی اس تہذیب کی روح اور پہچان ہے۔ اگر خدانخواستہ قرآن کی بالادستی میں کچھ کوتاہی کی گئی تو یہ تہذیب دوسری تہذیبوں سے کچھ مختلف نظر نہیں آسکتی۔ قرون اولیٰ کے بعد مثالی اسلامی تہذیب کا

پیدا ہونا اگرچہ ممکن نظر نہیں آتا مگر اُس مثالی اسلامی تہذیب کے مرکزی نقطہ سے انحراف کرنا یقیناً اس تہذیب کی وحدت، سیادت، حریت اور بالادستی کو ختم کر سکتا ہے۔

اسلامی تہذیب ہر طرف سے ہدف بنی ہوئی ہے اور اس کا ہمہ وقت دوسری تہذیبوں کا ہدف بنے رہنا ہی اس کا امتیاز ہے۔ اسلام واحد مکمل، برحق نظامِ حیات اور تمام مسائل کا حل ہے اور اس سے جنم لینے والی تہذیب کا برحق ہونا ایک ظاہری بات ہے جو ہمیشہ دوسری طاغوتی نظاموں پر استوار تہذیبوں سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ جہاں اسلامی ثقافتوں میں مختلف جغرافیائی علاقہ جات میں کیے گئے اجتہادات کی وجہ سے ایک لچک نمایاں ہے وہیں اس کے مرکزی نقطہ -توحید- میں یگانگت اور یک رنگی بے حد ضروری ہے جو ان ظاہری طور پر مختلف دِکھنے والی ثقافتوں کو ایک مکمل اور زندہ تہذیب کے بطور پیش کرتی ہے اور اس مرکزی نقطہ سے کسی بھی قسم کا انحراف پوری اسلامی تہذیب کو منتشر کر سکتا ہے کیونکہ یہ واحد نقطہ ہے جس سے تمام اسلامی ثقافتوں کی ڈور جڑی ہوئی ہے اور یہ تمام ثقافتیں تب جا کر منجملہ ایک تہذیب کی صورت اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عالم اسلام کی موجودہ منتشر حالات اسی مرکزی نقطہ سے انحراف کی وجہ ہے۔ عالم اسلام جہاں قائدانہ صلاحیت رکھنے والے قائد سے محروم ہے وہیں پوری اسلامی تہذیب قائدانہ صلاحیت رکھنے والی ریاست (core state) سے بھی خالی ہے۔ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ اجتماعی طور پر اپنے بنیادی نقطہ توحید سے منحرف ہو گئی ہے۔

عرب اگرچہ اس منتشر امت کی قیادت کا مادہ رکھتا ہے مگر اس نے توحید کا مرکزی عنصر محض عبادات اور رسوم کی حد تک محدود کر رکھا ہے اور اس کی بین الاقوامی پالیسی اور عالمی سیاسی نظریہ اس مرکزی نقطہ سے متصادم ہے، جب کہ ایران عالمی سیاست کے بازار میں اس مرکزی نقطہ سے قریب تر رہنے کی کوشش میں رہا مگر بنیادی سطح پر وہ بھی اس مرکز سے دور ہوتا گیا۔ غرض عالم اسلام کے یہ دو بڑے اجزاء عالم اسلام کی قیادت اور رہبری سے محروم رہے اور پوری امت مسلمہ نے ان دو میں سے ایک پر بھی متفق ہونا قبول نہیں کیا۔

مسلمان ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش *

.....

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے **

سموئیل ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم کا نظریہ پیش کر کے بظاہر پوری دنیا میں ایک تہلکہ برپا کیا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ نظریہ بھی دیگر نظریات کی طرح اسلامی تہذیب کے وجود کو للکارنے کی قوت تک نہیں رکھتا ہے۔ اسلامی تہذیب ٹھوس اور برحق عملی (practical) بنیادوں پر استوار ہے جو تمام عالمی مسائل کا واحد اور برحق حل اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اس لئے اس کی طرف ہر ایک قوم کو ان کی فطرت کی پکار کے مطابق رجوع کرنا ہی پڑے گا۔

اس کتاب میں، میں نے سموئیل کے نظریات کو جہاں تولنے اور جانچنے کی کوشش کی ہے وہیں میں نے اسلام کے تناظر میں تہذیبوں اور ثقافتوں کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں عالم اسلام کے سیاسی حالات کا تاریخی پس منظر پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش گئی کی ہے کہ عالم اسلام میں برپا مسائل مغرب اور اس کے اتحادیوں نے پیدا کئے ہیں اور ان مسائل کی ایک اچھی خاصی تاریخ ہے جس سے صَرف نظر پورے مسئلہ کو معما بنا دیتا ہے۔ یہ کتاب سموئیل کی کتاب کا حرف بہ حرف رد نہیں بلکہ اس کے منجملہ نظریہ ''تہذیبی تصادم'' کا علمی اور تنقیدی تجزیہ ہے۔

علامہ اقبال کی فکر کا اس جدید نظریہ ''تہذیبی تصادم'' کے ساتھ تقابل کرنا حادثاتی طور پر ممکن نہیں ہوا بلکہ یہ انتخاب کافی سوچ سمجھ کے بعد کیا گیا ہے اور اس انتخاب کی کئی

---

* کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۱۵۔
** کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۱۵۔

وجوہات بھی ہیں جن کا ذکر کتاب میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔ اختصار کو مدِ نظر رکھ کر یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ علامہ اقبال مشرق میں پیدا ہوئے، مغرب میں ذہنی نشو ونما پائی اور مغرب سے علمی اور عملی طور پر قریب رہنے کے باوجود اس سے مرعوب نہ ہوئے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ علامہ اپنے ماضی سے جس قدر باخبر تھے اس قدر وہ مغربی تہذیب کے ظاہر و باطن، ماضی و حال اور مستقبل پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اگر علامہ کا تقابل دوسرے مشرقی مفکرین سے کیا جائے تو دوسرے مشرقی مفکرین یا تو مغرب سے مرعوب نظر آئیں گے یا پھر وہ مغربی تہذیب کے کنارے پر رہ کر سطحی طور پر اس تہذیب کے ظاہری خدوخال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشرقی مفکرین اکثر مغرب کے ظاہری اثر اور بناوٹی خدوخال کے پھیلاؤ کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں جبکہ علامہ اقبال مغربی تہذیب کے بنیادی فساد اور جڑوں پر ایسی گہری نظر رکھتے ہیں جس کی بنا پر وہ اس کے برے انجام اور خطرناک اختتام کی پیشین گوئی فرماتے ہیں۔ علامہ اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ وہ یہ پیشین گوئی تب فرماتے ہیں جب مغرب ہر طرف سے محوِ ترقی تھا اور اس میں تنزل کے عناصر عام نظروں سے اوجھل تھے۔

وہ مغربی مفکرین کا نہ صرف مطالعہ کرتے ہیں بلکہ ان کے تاثرات و خیالات کے عقب میں کارفرما اسلام کش ذہنیت کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ مسلمان کو تب مسلمان مانتے ہیں جب وہ ان سازشوں سے واقفیت رکھ کر ان کے مقابلہ کی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی*

علامہ اقبال اس دور میں پیدا ہوئے جب عالمِ اسلام سخت مضطرب حالات میں پھنسا ہوا تھا اور سموئیل ہنٹنگٹن کا نظریہ اس وقت دنیا کے سامنے پیش ہوا جب ایک مرتبہ پھر

---

* کلیاتِ اقبال، بانگِ درا، ص ۲۶۷۔

عالم اسلام انتشار اور پراگندگی کا شکار ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں مفکرین ایک جیسے حالات میں سانس تو لے رہے ہیں مگر دونوں کے خیالات اور تجربات ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے تقابل کرنے کے لئے موزون بناتا ہے۔

یہ کتاب جہاں اللہ کے فضل و کرم کے بغیر ممکن نہ تھی وہیں اس کتاب کے محرک میرے شفیق اُستاد پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب- ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر- ہیں۔ کچھ وقت تک مجھے ان کی نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا اور اس دوران میری انہوں نے جس قدر حوصلہ افزائی فرمائی شاید یہ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ یہ عظیم کام میرے ہاتھوں مکمل ہوا۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے شکریہ کے الفاظ اس قدر کم پڑ رہے ہیں کہ میرے دل کے جذبات الفاظ کی تنگدامنی محسوس کر رہے ہیں۔ پھر بھی میں ان کی شفیق سرپرستی اور نگرانی کا تہہ دل سے مشکور ممنوں ہوں۔ اللہ ان کو اس کا جزائے خیر عطا فرمائے۔

پروفیسر عبدالحق - سابقہ صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی- کے ساتھ کئی دفعہ اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے اس کتاب پر ''تبریک'' لکھ کر راقم کی جس قدر عزت افزائی کی ہے میں اس کے لئے ان کا بھی کافی مشکور ہوں۔

ڈاکٹر تسکینہ فاضل (ریڈر اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر) محترم اعجاز اشرف اور محترم شہناز اقبال کی رفاقت دورانِ تحقیق الحمدللہ کافی فائدہ مند رہی۔ میں ان کی شفیق رفاقت کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔

محترمہ وحیدہ شہری (لائبریرین اقبال انسٹی ٹیوٹ)، محترمہ شمس النساء (لائبریرین شعبہ تاریخ یونیورسٹی آف کشمیر)، محترم عبدالحمید بٹ، محترم مظفر احمد بزاز، محترم شیخ جمیل، محترم شعیب مختار، محترم اشتیاق سبطین اور محترم بشارت مسعودی جیسے رفیقوں کو بھولنا بے شک ناشکری ہوگی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی آراء سے میری مدد کی بلکہ کتابوں اور علمی مواد کے ذخائر بھی میرے لئے وا کئے۔ اللہ ان کو اس کا جزائے خیر دے۔ میں ان سب خیر اندیشوں

کا بھی مشکور ہوں۔

اس کتاب کی خوبصورتی اور تزئین میں میرے دوست محترم ضمیر احمد کا جس قدر ہاتھ ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے نہ صرف کتاب کی کمپوزنگ بڑی خوبی کے ساتھ مکمل کی بلکہ دورانِ کمپوزنگ میری طرف سے مسودہ میں وقتاً فوقتاً ہو رہے تغیر و تبدل کو بھی ہنستے ہوئے برداشت کیا۔ اللہ اُن کو اس کا نیک اجر دے۔

آخر میں میں اپنے عزیز دوست محترم سید سجاد احمد اندرابی صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے بڑی باریکی کے ساتھ اس پوری کتاب کو ایک نہیں، دو نہیں بلکہ کئی بار پڑھا اور مجھے ہر وقت اپنے زرّیں مشوروں سے نوازتے رہے۔ میں یہ کتاب ان کی پاکبازی اور ان کے صالح کردار سے متاثر ہو کر ان کے نام منسوب کرتا ہوں۔ اللہ کرے یہ کتاب میرے اور مذکورہ تمام افراد کے حق میں قیامت کے دن اعمالِ صالحہ میں شمار ہو۔

﴿ یوم لا ینفع مال و لا بنون ★ الا من اتی اللّٰہ بقلب سلیم ﴾ *

معید الظفر
اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر

۷ شوال ۱۴۲۵ ہجری
۲۰ نومبر ۲۰۰۴ عیسوی

---

* القرآن، ۲۶: ۸۸-۸۹

باب اوّل

تہذیبی تصادم کیا ہے؟

دورِ جدید میں وقتاً فوقتاً مختلف نظریات کو پیش کر کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی مقاصد حاصل کئے گئے ہیں۔ ڈارون (Darwin) کا نظریۂ ارتقا، یورپ اور اس کے ہم خیالوں کی سامراجی ذہنیت کو بنیاد فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا جبکہ کمیونزم کی آڑ میں مختلف مذاہب کو نشانہ بنایا گیا۔ غرض کسی بھی حرکت کو انجام دینے کے لئے پہلے ایک نظریہ پیش کیا جاتا ہے پھر اس حرکت کو اس نظریہ کی دلیل بتا کر اپنی بے جواز حرکت کا جواز فراہم کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں دنیا کے سیاسی اور اقتصادی حالات نے شدید تبدیلی کو رونما ہوتے دیکھا۔ ایک طرف ایرانی انقلاب نے اہلِ مغرب کے سیاستدانوں کو پریشان کر دیا۔ جبکہ دوسری طرف سرد جنگ کے اختتام اور سوویت یونین کے ٹوٹ جانے سے پوری دنیا کے کمزور اور اسلامی ممالک پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہوئے۔ دنیا سیاسی نقطۂ نگاہ سے یک قطبی (Unipolar) ہو کر رہ گئی اور مغرب کی بین الاقوامی آمریت (International Dictatorship) اُبھر کر سامنے آنے لگی۔

اسی دوران دنیا میں کئی کتابوں نے تہلکہ مچا کر اختلافات کو جنم دیا جن میں سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب 'شیطانی آیات'، تسلیمہ نسرین کی 'لجا' اور سموئیل ہنٹنگٹن کی The Clash of Civilizations زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع تہذیبی تصادم ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم موخر الذکر کتاب تک ہی اپنی بحث کو محدود رکھیں۔

۱۹۹۳ کے گرما میں Foreign Affairs نامی ایک میگزین میں ایک مقالہ بعنوان

'تہذیبی تصادم کیا ہے؟' (The Clash of Civilizations?) شائع ہوا۔ یہ مقالہ ہارورڈ یونیورسٹی میں کام کر رہے پروفیسر سموئیل پی ہنٹنگٹن نے تحریر کیا تھا۔ سموئل جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹیجک اسٹیڈیز کے ڈائریکٹر اور ہارورڈ اکیڈمی فار انٹرنیشنل اینڈ ایریا اسٹیڈیز کے چیرمین بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ امریکن پولٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ چونکہ مقالہ مابہ النزاع تھا اس لئے اس پر کافی بحث وتمحیص نے جگہ لی اور ماحول کو کافی گرم رکھا۔ اس مقالہ پر ہر ایک اقلیم اور کئی ممالک سے جوابات اور خیالات ظاہر کئے گئے۔ لوگ اس نقطۂ نگاہ سے مختلف درجہ متاثر، ہم، دہشت زدہ اور حیران ہو گئے کہ آنے والی عالمی سیاست مختلف تہذیبوں سے وابستہ مختلف گروہوں کے درمیان تصادم کا نتیجہ ہوگی۔ یہ تصادم اس عالمی سیاست کی مرکزی اور سب سے خطرناک جہت ہوگی۔[1]

بعد میں سموئیل نے اس مابہ النزاع مقالہ کو مزید واضح کرتے ہوئے اس کو ایک مستقل کتاب کی شکل دی۔ اس کتاب کا نام The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order رکھا گیا جس نے پوری دنیا میں ہلچل مچادی۔ مذکورہ کتاب، کتاب سے زیادہ ایک نظریہ ہے۔ جس کو بحیثیت نظریہ پڑھا اور پرکھا جانا چاہیے۔

سموئیل کے مطابق موجودہ دور میں تہذیبی تصادم دنیا کے امن وامان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور ایسا عالمی نظام جو تہذیبوں کی بنیاد پر مبنی ہو وہ عالمی جنگ کے خلاف ایک یقینی تحفظ ہے۔[2] اس نظریہ کا مقصد سرد جنگ کے بعد پیدا شدہ عالمی سیاست کی تاویل کرنا ہے۔ انہوں نے دنیا میں نمایاں تہذیبوں کے وجود کو اہم قرار دے کر آئندہ کی عالمی سیاست و نظام ان نمایاں تہذیبوں سے جوڑ کر دیکھنے کے تصور کو راہ دی ہے۔ ان کے نزدیک سرد جنگ کے اختتام کے بعد دنیا میں سات یا آٹھ[3] نمایاں تہذیبیں ہیں جن کے درمیان تصادم یقینی ہے۔

۱۔ مغربی تہذیب
۲۔ کنفیوشنی (چینی) تہذیب

کثیر التہذیب دنیا

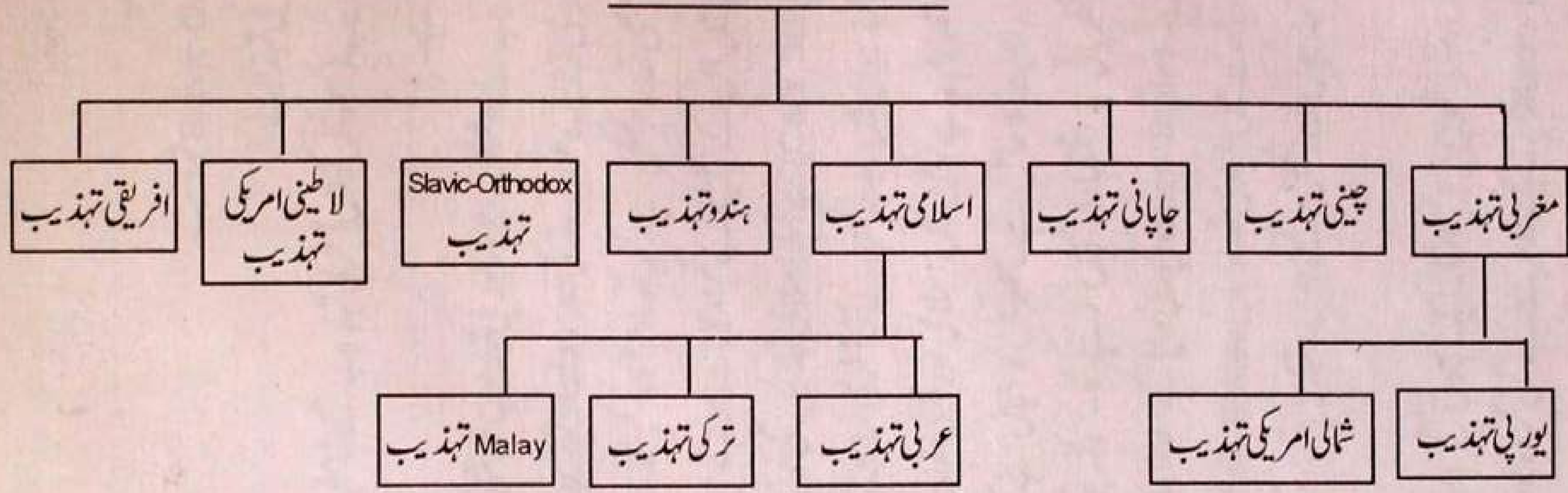

سموئیل ہنٹنگٹن کا موجودہ دنیا کے بارے میں ''تہذیبی'' نظریہ

[مقابل صفحہ نمبر ۲]

۳۔ جاپانی تہذیب

۴۔ اسلامی تہذیب

۵۔ ہندو تہذیب

۶۔ Slavic-Orthodox تہذیب

۷۔ لاطینی امریکی تہذیب

۸۔ افریقی تہذیب (سموئیل کو اس آخری تہذیب کے شاملِ تصادم ہونے میں پورا یقین نہیں ہے۔)[۴]

مغربی تہذیب کے دو مختلف اجزاء یورپی تہذیب اور شمالی امریکی تہذیب کی صورت میں ہیں جبکہ اسلامی تہذیب عرب، ترکی اور Malay تہذیبوں میں منقسم ہے۔ ایک ہی تہذیب کے اندر بھی تصادم ممکن ہے۔ یہ تصادم عموماً کم شدت کے ہوتے ہیں اور تہذیبی تصادم کے مقابلہ میں اس کے پھیلنے کے کم امکانات ہوتے ہیں۔ امریکہ مغربی تہذیب کی رہنما ریاست (Core State) ہے جبکہ اسلامی تہذیب کی کوئی کور اسٹیٹ موجود نہیں ہے۔

بیان کردہ تہذیبوں میں بہت ممکن ہے کہ آخری سات تہذیبیں پہلی تہذیب - مغربی تہذیب - سے متصادم رہے، جن میں اسلامی اور چینی تہذیبوں کا مغربی تہذیب سے متصادم رہنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ سموئیل کا خیال ہے کہ اس جدید دنیا میں تصادم بنیادی طور پر نظریاتی یا اقتصادی نہیں رہے گا۔ بلکہ تصادم کی غالب وجہ ثقافتی (Cultural) ہوگی۔ Nation States پوری دنیا کے معاملات میں طاقتور کردار ادا کریں گی۔ لیکن عالمی سیاست میں بنیادی تصادم ان Nation States اور گروہوں کے درمیان رہے گا جو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ تہذیبی تصادم مستقبل میں جنگوں کی بنیادی وجہ ہوگی۔[۵]

تہذیبی تصادم دو سطحوں پر برپا ہوگا۔ ایک چھوٹی سطح (Micro-Level) پر اور دوسری بڑی سطح (Macro-Level) پر۔ ایک دوسرے سے ملحق گروہ جو دو مختلف تہذیبوں سے وابستہ

ہوں جھگڑوں اور لڑائیوں میں پڑ جاتے ہیں، جبکہ بڑی سطح پر مختلف تہذیبوں سے وابستہ ممالک فوجی اور اقتصادی طاقت کے لئے رقابت اختیار کرتے ہیں، بین الاقوامی ادارہ جات (Institutions) پر تسلط قائم کرنے کے لئے اور اپنے خاص سیاسی اور مذہبی اقدار کو غالب کرنے کے لئے ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں۔ اگر دنیا میں پھر سے جنگِ عظیم برپا ہوتی ہے تو وہ مختلف تہذیبوں کے درمیان لڑی جائے گی۔[۶]

سموئیل کے مطابق یہ تہذیبیں دنیا میں کلیدی رول ادا کر کے ہر ایک ملک کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوں گی۔ سرد جنگ کے بعد مختلف ممالک اپنے مقاصد و مفادات تہذیبی عینک کے ذریعہ دیکھتے ہیں۔ وہ ان ممالک کے ساتھ ہو جاتے ہیں جو ثقافتی لحاظ سے ان سے ہم آہنگ ہوں اور اکثر ان ممالک کے ساتھ متصادم رہتے ہیں جو ممالک مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف ممالک کے لئے خطرہ وہ ملک بنتا ہے جو ان سے ثقافتی اختلاف رکھتا ہو۔ عوام اور سیاست دان طبقہ ان لوگوں اور ممالک سے کم خطرہ کی توقع رکھتے ہیں جو لوگ یا ممالک ان کے مطابق ان کی زبان، مذہب، اقدار، ادارہ جات اور ثقافت میں مشترک ہوں۔ وہ ان ممالک کی طرف سے اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں جو ممالک معاشرتی لحاظ سے ان سے مختلف ثقافتیں رکھتے ہوں اور اسی لئے وہ نہ تو ان کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو محسوس کر سکتے ہیں اس لئے وہ ان پر بھروسہ بھی نہیں کرتے۔[۷]

تہذیبیں ترقی اور تنزل کی شکار ہوتی ہیں۔ وہ ٹوٹتی اور جڑتی ہیں۔ تہذیبیں دنیا سے غائب ہو کر ماضی میں دفن ہو جاتی ہیں۔ چونکہ دنیا سکڑ گئی ہے اس لئے مختلف تہذیبوں سے وابستہ لوگوں کے درمیان میل ملاپ بڑھ رہا ہے جس سے تہذیبی فرق واضح ہو رہی ہے اور لوگ اس بارے میں حساس ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے یہ بھی ایک وجہ ہے جس سے مختلف تہذیبوں میں تصادم برپا ہو سکتا ہے۔[۸]

عالمی اقتصادی جدت اور معاشرتی تبدیلی نے لوگوں کو اپنی علاقائی (local) پہچان سے الگ کیا ہے جس سے Nation States بھی کمزور ہوئی ہیں۔ نتیجتاً مذہب نے اس

تہذیبوں کی عالمی سیاست اور ابھری صف بندی ہنٹنگٹن کی نظر میں:

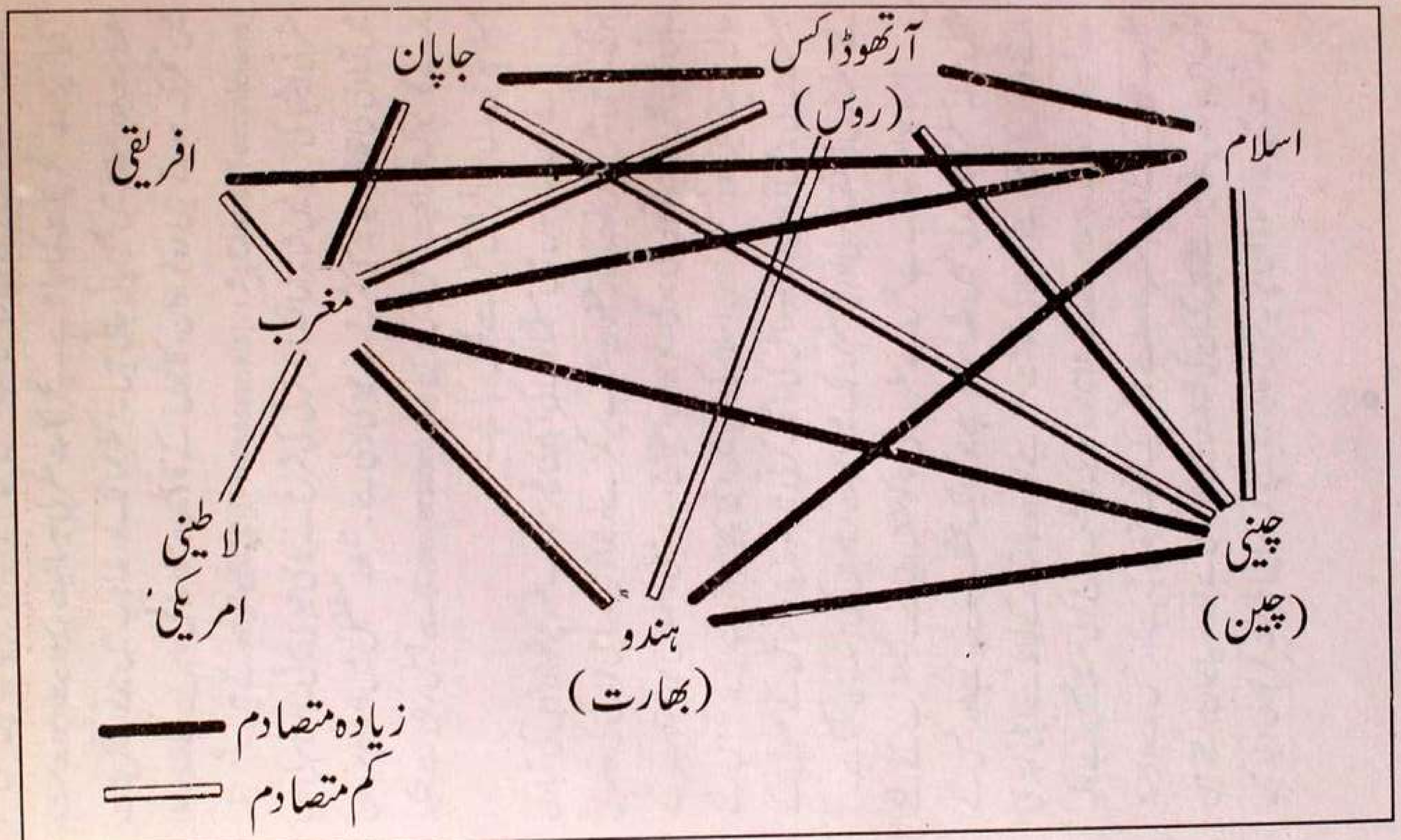

[مقابل صفحہ نمبر ۴]

خلاء کو پُر کر کے لوگوں کو نئی پہچان دی ہے، جس کی اکثر وجہ وہ تحریکات ہیں جن کو ''بنیاد پرست'' تحریکات کہا جاتا ہے۔ یہ تحریکات مغربی عیسائیت، یہودیت، بودھ مت، ہندومت اور اسلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اکثر ممالک اور مذاہب میں جو لوگ تحریکات میں متحرک ہوتے ہیں وہ نوجوان، کالجوں کے فارغین، متوسط فنی ماہرین (Middle Class Technicians) پیشہ ور (Professionals)، تاجران ہی ہوتے ہیں۔[9] جبکہ مشرقی ایشیا کی ترقی میں شاندار اقتصادی ترقی کی شرح نے بڑی تیزی لائی۔ اسلام کی احیا میں آبادی کی قابل دید بڑھتی شرح نے تیزی لائی ہے۔[10] اور مستقبل میں اسلام میدان مار لے گا کیونکہ عیسائیت اصل میں دین بدلی (Conversion) سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام دین بدلی اور افزائش نسل سے پھیل رہا ہے۔[11]

آنے والے برسوں میں مسلمانوں کی آبادی غیر مناسب طور پر نوجوانوں کی آبادی ہوگی۔ جس میں قابل توجہ اُبھار عنفوانِ شباب پر کھڑے نوجوانوں اور اپنی زندگی کی دوسری دہائی میں چل رہے لوگوں کی ہوگی۔ نوجوان احتجاج، بے ثباتی، اصلاح اور انقلاب کے حامی ہوتے ہیں اور مسلم نوجوان اسلام کی احیا میں اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔[12] اس لئے مسلمانوں کی بڑھتی آبادی زیادہ وسائل کی مانگ کرتی ہیں اور زیادہ وسائل کے حصول کے لئے مسلمانوں کی مختلف مغربی اور غیر مسلم ممالک میں ہجرت کرنا وہاں بھی مسئلہ بن سکتا ہے۔[13]

اسلام واحد تہذیب ہے جس نے مغرب کی بقا کو مشتبہ بنایا ہے۔[14] مغرب کے لئے اصل مسئلہ مسلم 'انتہا پسندی' نہیں بلکہ اسلام ہے جو کہ ایک مختلف تہذیب ہے اور جس کے ماننے والوں کا یقین ہے کہ ان کی ثقافت بہتر ہے اور وہ طاقت کے لحاظ سے اپنی کہتری سے آسیب زدہ ہے۔ اسلام کے لئے CIA اور امریکہ کا شعبہ دفاع کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مغرب ان کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے جو کہ ایک مختلف تہذیب ہے اور جس سے وابستہ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی ثقافت بین الاقوامی ہے اور وہ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ طاقت میں برتر ہونا ان پر یہ فرض عاید کرتا ہے کہ وہ اپنی ثقافت کو پوری دنیا میں

پھیلا دے۔ یہ وہ بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جو اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کو تیز کرتے ہیں۔[15] غرض مغرب کا ''آفاقی تہذیب'' ہونے کا دعویٰ کرنا اس کو دوسری تہذیبوں کے ساتھ بالعموم اور اسلام اور چین کے ساتھ بالخصوص ایک سخت تصادم میں کھڑا کرتا ہے۔[16]

مغربی تہذیب کو زوال سے بچانے کے لئے پروفیسر سموئیل مغربی ممالک کو کچھ ضروری نکات پر عمل کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ اور یورپی ممالک کے لئے ضروری ہے کہ:

☆ وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی، اقتصادی اور فوجی انضمام حاصل کرے اور اپنی پالیسیوں کو مربوط رکھا جائے تا کہ دوسری تہذیبوں سے وابستہ ممالک کو ان کے درمیان موجود اختلافات سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا جائے۔

☆ وہ یورپین یونین اور NATO میں وسطی یورپ کے مغربی ممالک کو شامل کرے۔

☆ وہ لاطینی امریکہ میں ''مغربیت'' کی حوصلہ افزائی کرے اور جہاں تک ممکن ہو لاطینی امریکی ممالک کو مغرب کے ساتھ صف بند کرے۔

☆ وہ اسلامی اور چینی ممالک کی رسمی اور غیر رسمی فوجی طاقت کو قابو میں کرے۔

☆ وہ جاپان کی مغرب سے بڑھتی دوری اور چین سے بڑھتی اس کی ہم آہنگی کی رفتار کو سست کرے۔

☆ وہ روس کو Orthodoxy کے رہنما ملک (Core State) کی حیثیت سے قبول کرے۔ ساتھ میں اس کو خطہ کی ایسی بڑی طاقت مانے جس کے جائز مفادات اس کی اپنی جنوبی سرحدوں کے تحفظ میں ہیں۔

☆ وہ دوسری تہذیبوں پر مغربی ٹیکنالوجی اور فوجی برتری کو برقرار رکھے۔

☆ اور سب سے اہم کہ وہ محسوس کرے کہ دوسری تہذیبوں کے مسائل میں اس کی مداخلت کرنا اس کثیر التہذیب دنیا میں بے ثباتی اور عالمی تصادم کی اہلیت کا شاید

سب سے زیادہ خطرناک اور واحد ذریعہ ہے۔[17]

عملاً مغرب بین الاقوامی ادارہ جات، فوجی طاقت اور اقتصادی وسائل کا استعمال اس طرح کر رہا ہے تاکہ مغربی برتری کو برقرار رکھا جائے اور مغربی مفادات اور مغربی سیاسی اور اقتصادی اقدار (Values) کی تائید ہو سکے۔[18] اس کے علاوہ مغرب کو چاہیے کہ اپنی بالادستی بنائے رکھنے کے لئے اسلامی اور چینی ممالک کے درمیان موجودہ اختلاف سے فائدہ اٹھائے اور دوسری تہذیبوں میں موجود ایسے گروہوں کی حمایت کرے جو گروہ مغربی تہذیب کے اقدار و مفادات کے ہمدرد ہوں۔[19] کیونکہ آنے والے دور میں تہذیبی تصادم عالمی امن کے لئے عظیم خطرہ ہے اور ایسا بین الاقوامی نظام جو تہذیبوں پر مبنی ہو وہ جنگ عظیم کے خلاف یقینی تحفظ ہے۔[20]

سموئیل کے مقالہ اور کتاب سے ان چنندہ اقتباسات کو نقل کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ آپ اس نظریہ کو کچھ حد تک سمجھ سکیں۔ اور اس میں موجود ان عناصر سے بھی باخبر ہو جائیں جو عناصر غیر مغربی تہذیبوں کے لئے رونگٹے کھڑے کرنے والے ہیں۔ اسلامی تہذیب کا جو تعارف اس نظریہ میں دیا گیا ہے اس کا تجزیہ صاف بتا رہا ہے کہ اسلامی تہذیب اب کھلم کھلا مغربی تہذیب کے نشانہ پر ہے۔ اور مغرب کی یہ کوشش ہے کہ کسی طرح ان خدشات کو ختم کیا جائے جو مغربی تہذیب کے مفادات اور بقا کے خلاف کبھی بھی عملی جامہ پہن کر اسلامی تہذیب کو مغرب کے تسلط سے آزاد کر سکتے ہیں۔

موجودہ دنیا کا ابتر نظام اور عالم اسلام اور عالم مغرب کی موجودہ صورتِ حال محض چند سالوں کی داستان نہیں بلکہ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کی جڑیں ہمارے ماضی میں بہت دور تک پیوست ہیں اور انہیں تاریخی حقائق کی روشنی میں اس ابتری کو صحیح طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

ثقافت اور تہذیب

ثقافت (Culture) اور تہذیب (Civilization) کیا ہیں؟ یہ ایسا پیچیدہ سوال ہے

جس کا تشفی بخش اور حتمی جواب شاید دنیا میں کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جارہا ہے، انسانی اقدار میں بدلاؤ آرہا ہے۔ اُسی قدر ان اصطلاحات کی تعریف بھی بدل جاتی ہے۔ عمرانیات سے تعلق رکھنے والے اہل علم ان اصطلاحات کو عمرانی زاویۂ نگاہ سے دیکھ کر ان کی جو تعریف کرتے ہیں وہ تعریف اہل فلسفہ کے یہاں پوری طرح قابل قبول نہیں ہوتی اسی طرح عالمی اقتصادیات پر نظر رکھنے والے ماہرین کا خیال عالمی سیاستدان طبقہ سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ غرض ہر ایک طبقہ اپنی اپنی ضروریات اور اپنے اپنے فن میں درپیش مسائل کے مطابق ان کی تعریف بیان کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی شعبہ سے تعلق رکھنے والے مفکرین اگر دو مختلف ممالک یا دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوں تو یہ یقینی امر ہے کہ ان کے تاثرات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے، انگریزی میں اس کو کلچر (Culture) کہتے ہیں اور بطور اسم (Noun) استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ماخذ لاطینی لفظ Cultūra[21] ہے جسکے معنیٰ، دیکھ بھال کرنا، یا عیسائی نقطۂ نگاہ سے "پرستش کرنا" ہے اور بنیادی طور پر فعل ہے۔ جو اس کے جمود کی نفی کرتا ہے۔

ثقافت کے اصطلاحی معنیٰ میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر کسی گروہ یا فرد کی اکتسابی اہلیت یا قابلیت جس کے ذریعے وہ عموماً مسلّمہ جمالیاتی اور ذہنی ذوق کی شناخت اور تحسین کرسکتا ہے ثقافت کی تعریف میں آتا ہے۔[22] تعلیم اور تربیت کے ذریعے فہم و آداب کو ترقی دینا اور شائستہ بنانا بھی اس کی تعریف میں شامل ہے۔[23] اسی طرح مجموعی طور پر انسانی رویہ اور اس کے نتائج جو فکری، تقریری، عملی اور دستکاری کی صورت میں مجسم ہوتے ہیں، انسانی ثقافت کہلاتا ہے۔ انسان کا یہ رویہ ایک آدمی کی اکتسابی اہلیت پر منحصر کرتا ہے جو ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور جس کے انتقال میں مختلف آلات، زبان، مروجہ عقائد، سماجی حالات، مادی خصوصیات کا عمل دخل ہوتا ہے۔[24]

کچھ مغربی مفکروں کا خیال ہے کہ ثقافت کی اصطلاح عمومی طور پر ایک تہذیب کے دانشمندانہ (Intellectual) پہلو سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح مادی کامیابی کے عقلی

پہلو پر بھی زور دیتی ہے یا ایک فرد کے ذہنی و عقلی درجہ کو بھی بیان کرتی ہے۔[۲۵] عموماً ثقافت جغرافیائی حدود کی پابند ہوتی ہے اور دن بہ دن سازگار حالات ملنے کی صورت میں اپنی جغرافیائی حدود میں وسعت پیدا کرتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا مذکورہ اصطلاح پر یوں تبصرہ کرتی ہے:

''ثقافت کی وہ تعریف جس کو کلاسیکی تعریف کہا جاتا ہے انیسویں صدی عیسوی کے ماہر انسانیات Edward Burnett Tylor نے اپنی کتاب *Primitive Culture* (1871) کے پہلے پیرا میں یوں بیان کیا ہے۔

'ثقافت ۔۔۔ ایک ایسا مرکب مجموعہ ہے جس میں علم، عقائد، فن، اخلاق، قانون، روایات اور ایسی انسانی قابلیت اور عادات شامل ہیں جو ایک انسان معاشرہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے۔''[۲۶]

جہاں تک مسلم دنیا کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک ثقافت کی بیان کردہ تعریف سے متفق ہے مگر جہاں تک اسلامی ثقافت کا تعلق ہے تو کئی مسلم مفکرین اور دانشوروں کا خیال ہے کہ اسلامی ثقافت انسان کی تمام فکری اور عملی سرگرمیوں کو محیط ہے اور اس کا دامن ایسے اصول و قواعد اور مناہج و خصائص سے مالا مال ہے جو نہ صرف ان سرگرمیوں کی مزید نشوونما کی ضمانت دیتے ہیں بلکہ ان کو حیاتِ ابدی اور حسن بھی عطا کرتے ہیں۔[۲۷]

مسلم دانشوروں کے مطابق ثقافت اصل میں بڑی حد تک مذہب ہی ہے۔[۲۸] یہی نظریہ ابن خلدون کا بھی ہے۔ وہ مذہب کو مملکت اور کلچر کی بنیاد اور علت اولیٰ قرار دیتا ہے۔[۲۹] اس بات کو۔ کہ ثقافت ایک انسانی میراث ہے اور کسی مخصوص وطن سے مقید نہیں ہے، نہ اس کی مخصوص قومیت ہے اور نہ اس کا کسی معین مذہب سے رشتہ ہے۔ سائنسی اور فنی علوم اور ان کی علمی تشریح کی حد تک تو صحیح مانتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان ان علوم کے دائرہ کار کو پھاند کر ان کے نتائج کی فلسفیانہ تعبیر نہ کرنے لگیں، اور انسان کی تگ و دو اور انسانی تاریخ کی فلسفیانہ تاویل میں پڑ جاویں۔ اور فن و ادب اور وجدانی تعبیر کے مظاہر تک کی فلسفیانہ توجیہ کر ڈالیں۔[۳۰] ان کے یہاں اسلامی نقطۂ نظر سے ان تمام سائنسی اور فنی علوم اور ان کے عملی

تجربات کے پس منظر میں دو قسم کی ثقافتیں کارفرما ہیں:

۱۔ اسلامی ثقافت ۲۔ جاہلی ثقافت

اسلامی ثقافت ایک ایسی ثقافت ہے جو اسلام کے نظریۂ حیات پر قائم ہے جبکہ جاہلی ثقافت کی اساس و بنیاد ان کے نزدیک فکرِ انسانی کو مرجعِ صحت وعدم صحت قرار دیتا ہے۔ جس سے انسانی فکر الٰہ بن جاتی ہے اور ایسی ثقافت اللہ کی ہدایت سے محروم رہتی ہے۔[۳۱]

ثقافت (Culture) کے بعد ایک انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تہذیب (Civilization) کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب ایک وسیع اصطلاح ہے جس کے معنی میں کشادگی پائی جاتی ہے۔

تہذیب کی انگریزی صورت Civilization بنتی ہے۔ انگریزی میں اس کا استعمال بحیثیت اسم ہوتا ہے جس کے معنی تربیت، اصلاح، درستی وغیرہ ہے۔ تہذیب انسانی معاشرے کی وہ کیفیت ہے جس کی امتیازی خصوصیت ذہنی، تکنیکی، تمدنی اور معاشرتی ترقی ہوتی ہے۔[۳۲] تہذیب انسانی ثقافت کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس میں مکمل طور پر وحشیانہ پن اور غیر معقول طرزِ عمل موجود نہ ہو۔ اس میں مناسب حد تک مادی، ثقافتی، روحانی اور انسانی وسائل کا استعمال پایا جاتا ہے اور فرد معاشرتی ڈھانچہ میں رہ کر مکمل طور پر اس سے ہم آہنگ بھی ہوتا ہے۔[۳۳] کچھ اہلِ علم کا خیال ہے کہ تہذیب ثقافتی ترقی کا وہ درجہ ہے جس میں لکھنا موجود ہو اور جس میں ریکارڈ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔[۳۴] ضیاء الدین سردار تہذیب کو لوگوں کی مجموعی ثقافت کہتے ہیں۔[۳۵]

جہاں تک مسلم دنیا کے مفکرین کا خیال ہے وہ قوم کے علوم و آداب، فنونِ لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوارِ معاشرت، اندازِ تمدن، نمائشی ملبوسات وغیرہ کو نفسِ تہذیب نہیں مانتے اور نہ اس کو تہذیب کی اصل تصور کرتے ہیں بلکہ وہ اس کو کسی بھی تہذیب کے نتائج و مظاہر اور شجرِ تہذیب کے برگ و بار گردانتے ہیں۔ مسلم مفکرین دنیا میں صرف دو معاشروں کے وجود کے قائل ہیں۔

۱۔ اسلامی معاشرہ ۲۔ جاہلی معاشرہ

اسلامی معاشرہ میں انسانی زندگی کی زمامِ قیادت اسلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جبکہ جاہلی معاشرہ میں اسلام عملی زندگی سے خارج ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں وہ ''مسلم'' معاشرہ بھی گِنا جائے گا جس میں اسلامی شریعت کو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہ ہو۔ ایسے معاشرے میں اگر نماز، روزے اور حج کا اہتمام بھی موجود ہو تو بھی اسلامی معاشرہ نہیں ہوگا۔[۳۶] تقریباً یہی نظریہ M.M. Picthal نے بھی پیش کیا ہے۔ وہ اس ثقافت کو اسلامی ثقافت مانتے ہیں جس کو اسلام نے پیش کیا ہے جس میں انسانوں کی ترقی یقینی ہے۔[۳۷] جبکہ ڈاکٹر محمد علی ضناوی کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب حیات و کائنات سے متعلق اسلامی مفاہیم کے تحت ایک انسانی جماعت کی سرگرمیوں کے تفاعل کا نام ہے جو روئے زمین میں اللہ کی خلافت کو وجود میں لاتی ہے۔[۳۸]

مولانا مودودی دین اسلام اور اسلامی تہذیب کو ایک تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسلامی تہذیب ایک مکمل نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اعمال و اخلاق اس کی انفرادی، خانگی، اجتماعی، اقتصادی، سیاسی زندگی پر محیط ہے، اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین اللہ نے مقرر کئے ہیں ان کے مجموعہ کا نام ''دین اسلام'' یا ''اسلامی تہذیب'' ہے۔[۳۹]

مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ہم روح ثقافتوں کے قدرتی انضمام سے ایک تہذیب بنتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک وسیع تہذیب میں مختلف ثقافتوں کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر دو ثقافتیں مختلف روح رکھتی ہوں وہ قطعاً قدرتی طور پر ایک ہی تہذیب کے بنیادی عناصر نہیں بن سکتی۔ اسی لئے تمام مسلم علاقہ جات مختلف علاقائی ثقافت رکھنے کے باوجود بحیثیت ایک تہذیب دیکھے جاتے ہیں۔ اس تہذیب میں یورپ کی آغوش میں پلنے والا بوسنیا، ایشیا کی آب و ہوا میں ترقی پانے والا پاکستان اور افریقہ کی سرزمین میں قائم مصر اسلامی روح کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے ہم پلہ اجزاء و عناصر ہیں۔

Robert Redfield کے مطابق تہذیب ان لوگوں کا فاضلانہ طرزِ عمل ہے جو غیر معمولی طور پر غیر مستقل اور مرکب معاشروں سے تعلق رکھتے ہوں اور ایک تہذیب ثقافت سے اس صورت میں مختلف ہے کہ ثقافت سادہ اور زیادہ مستقل لوک معاشروں (Folk Societies) سے وابستہ افراد کے حاصل شدہ طرزِ عمل کا نام ہے۔[۴۰]

بیان کردہ تعریفیں مختلف مسلم اور مغربی دانشوروں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہی ہیں چونکہ اس کتاب کی بحث کا تعلق نظریۂ تہذیبی تصادم سے ہے جس کے موجد ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سموئیل ہے تو بہتر ہے کہ ان کے یہاں تہذیب کی مقبول تعریف کو بھی دیکھا جائے:

> ''انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ انسانیت کے ارتقاء کے سلسلے میں [اس سے ہٹ کر] دوسرے خطوط پر سوچنا ممکن نہیں ہے۔۔۔۔ تہذیب کا تصور اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی مفکرین نے بربریت کے تصور کی ضد میں پیش کیا۔ مہذب معاشرہ قدیم معاشرہ سے ایک جگہ آباد ہونے میں شہری اور خواندگی کے وجود کی بناء پر مختلف ہوتا ہے۔ مہذب ہونا اچھا اور غیر مہذب ہونا برا سمجھا جاتا تھا۔ تہذیب کے تصور نے ایک ایسا معیار قائم کیا جس سے معاشروں کو پرکھا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے دوران یورپیوں نے بہت زیادہ ذہنی، سفارتی حکمت اور سیاسی قوتیں صرف کر کے اصولوں میں توسیع کرنے کی کوشش کی تاکہ غیر یورپی معاشروں کو کافی حد تک 'مہذب' قرار دے کر ان کو یورپ کی طرف سے مغلوب بین الاقوامی نظام میں قبول کیا جائے۔ اسی دوران لوگوں نے مختلف تہذیبوں کا اظہار کیا۔ اس کے معنی اس 'ایک تہذیب' کے خیال سے دستبردار ہونا ہے جس کو مثالی تہذیب کہا جاتا ہے۔ جس کے مطابق اس خیال میں تبدیلی لانا تھا کہ ہمارے پاس مہذب ہونے کا صرف ایک معیار موجود ہے۔۔۔ جو چند خاص لوگوں یا گروہوں - جو انسانیت کے ممتاز زعما ہیں - کے لئے قابلِ قبول تھا۔ اس کے بدلے ہمارے پاس کئی تہذیبیں موجود ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر مہذب ہے۔
>
> ۔۔۔ تہذیب اور ثقافت دونوں لوگوں کے منجملہ طریقۂ زیست کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور تہذیب اصل میں ثقافت ہی ہے۔ یہ دونوں یعنی تہذیب اور

ثقافت اپنے اندر اقدار، قواعد، ادارہ جات اور اس اندازِ فکر جس کو ایک معاشرہ میں آنے والی آئندہ نسلیں بنیادی اہمیت دیتی ہوں شامل کرتی ہیں۔

---باقی تمام عناصر- جو تہذیبوں کو واضح کرتے ہیں- کے علاوہ مذہب عمومی طور پر تہذیبوں کا سب سے زیادہ اہم عنصر ہے----

---تہذیب اور نسل یکساں نہیں ہے۔ ایک ہی نسل سے وابستہ افراد تہذیب کی وجہ سے پوری طرح الگ الگ ہو سکتے ہیں اور اسی طرح مختلف نسلوں سے وابستہ افراد تہذیب کی وجہ سے ایک ہو سکتے ہیں۔

---تہذیب اصل میں وسیع ترین ثقافتی وجود ہے"۔[41]

درج بالا بیان اور دیگر حوالہ جات سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت اور تہذیب میں بنیادی عنصر مذہب ہی ہے۔ اگر ایک انسانی معاشرہ کے مذہب کو بدل دیا جائے تو اس کی تہذیب بدل سکتی ہے اور اگر ایک انسانی معاشرہ کی تہذیب کو بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے مذہب میں بھی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اُٹھا تھا وہ اطراف کے علاقوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی ثقافت و تہذیب بدل کر رہ گئی اور جب یونان اور رومی تہذیب نے عیسائیت قبول کی تو پوری عیسائیت کی تصویر ان طاقتور تہذیبوں کے اثر سے بدل کر رہ گئی۔ غرض ان دو کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک میں واقع تبدیلی دوسرے پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ اگر کسی انسانی معاشرہ سے مذہب کے بنیادی عنصر کو نکالا جائے تو یہ قانونِ قدرت ہے کہ اس معاشرہ میں مذہب کی جگہ کوئی فلسفہ یا زبان یا قومیت وغیرہ لے سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی انسانی معاشرہ اس بنیادی عنصر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ سرد جنگ کے دوران دنیا کے ایک بڑے حصہ نے مذہب کو خیر باد کہنے کی کوشش کی مگر آگے چل کر ان کا فلسفۂ اشتراکیت ہی ان کا مذہب بن گیا اور اسی لئے شاید Bertrand Russell کمیونزم کو دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب شمار کرتا ہے۔[42] جبکہ کمیونزم مذہب کو رد کرتا ہے۔

مغربی محققین کے مطابق تہذیب ایک سماجی نظام (Social Order) ہے جو ثقافتی تخلیق (Cultural Creation) کو فروغ دیتا ہے۔ چار عناصر اس کی ترکیب کے بنیادی اجزا ہیں۔ یہ عناصر یوں ہیں:

۱۔ اقتصادی اہتمام (Economic Provision)

۲۔ سیاسی نظام

۳۔ اخلاقی اقدار اور

۴۔ علم وفن کی جستجو [۴۳]

دنیا کے جتنے بھی عظیم مذاہب اس وقت زمین پر موجود ہیں ان میں سے صرف ایک مذہب ایسا ہے جس میں یہ چاروں عناصر پائے جاتے ہیں۔ عیسائی مذہب میں سیاسی نظام مفقود ہے جبکہ ہندو مذہب سیاسی اور اقتصادی نظام سے خالی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام واحد دین ہے جس میں اپنا اقتصادی و سیاسی نظام اور منفرد اخلاقی اقدار اور علم وفن کی مستقل جستجو کے عناصر بطور اہم اجزاء شامل ہیں۔ اس سے اسلامی تہذیب اسلامی تشخص کی وہ صورت اختیار کرتی ہے جو ایک انسان کو ہر لحاظ سے دوسری تہذیبوں سے بے نیاز کرتی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ تہذیب و مذہب ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔

تہذیبوں کے عروج وزوال کے اسباب

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں تہذیبوں اور اقوام کا عروج و زوال سے گزرنا ناگزیر امر ہے۔ اقوام وتہذیبوں کا وجود اور پھر ان کا عروج ایک قدرتی عمل ہے۔ عروج کے بعد زوال پذیر ہونا بھی قانونِ قدرت میں داخل ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی تہذیب ہمیشہ بامِ عروج پر نہیں رہتی ہے اور نہ ہی کوئی تہذیب دائمی طور پر تاریک وادیوں میں بھٹکتی رہی ہے۔ غرض تہذیبوں کا عروج وزوال قانونِ قدرت کے مطابق ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ جب کسی قوم کے زوال کے اسباب مکمل ہو جاتے ہیں تو وہ قوم زوال پذیر ہونے کے باوجود بھی کسی خاص وقت تک اپنا کھویا مقام حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتی ہے اور اکثر دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ اس مغلوب قوم کا مقابلہ براہِ راست اس قوم سے ہوتا ہے جو قوم اس کی جگہ حاصل کر کے اس پر غالب آئی ہوتی ہے۔ اس کشمکش اور جستجو میں عموماً وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو قومیں پہلے ہی غالب ہوئی ہوتی ہیں کیونکہ مغلوب قوم اکثر دفعہ یا تو غالب قوم کی مخلص مقلد بن کر غالب قوم کی پیروی کرتی ہے یا پھر حواس باختی میں کوئی ٹھوس تدبیر اور لائحہ عمل اختیار کرنے میں ناکام رہ کر ان عوامل میں بھی غالب قوم سے برسرِ پیکار رہتی ہے جو عوامل اور عناصر خود اس کی اپنی ترقی اور عروج کے لئے بے حد ضروری ہوتے ہیں۔

یہ مسلم حقیقت ہے کہ حالات ہر آں بدلتے رہتے ہیں اور اسی لئے ہر ایک قوم جس وقت میں بھی پائی جاتی ہے وہ اپنے پیشروؤں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی کوئی قوم اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں بامِ عروج پر نظر آتی ہے تو کبھی یہی قوم زوال کی وادیوں میں منتشر دکھائی دیتی ہے۔ ہر ایک قوم کے حالات و عادات زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور اس بدلاؤ میں حکمرانوں کا کلیدی رول رہتا ہے۔[۴۴]

ڈاکٹر بشارت علی۔ استاد شعبہ عمرانیات کراچی یونیورسٹی۔ نے ابن خلدون کے مقدمہ پر ریسرچ کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون کے اس اہم نظریہ پر بحث کی ہے جو اس نے اسبابِ عروج و زوالِ امم کے بارے میں اختیار کیا ہے۔

"معاشرتی تنزل ابن خلدون کے زاویہ نگاہ سے افراد کے انحطاط، اخلاق اور ایمان کی پستی سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا قلب خوفِ خدا سے بے نیاز اور موت کے خوف سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ سفاکی اور خود غرضی، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انانیت کے روپ میں رونما ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی جدوجہد میں اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ ان کی یہ انانیت نظم اجتماعی کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہر قسم کی بداعتدالیاں، عیاشی، فحاشی، اخلاق سوزی، مادیات اور حسیات کا غلبہ، روح کی آبیاری کا نہ ہونا، مذہب

سے لاتعلقی، معاشرتی تعلقات سے بے نیازی، کف وقرابت داری کی پروانہ کرنا، بدچلنی اور اسی قسم کے دوسرے موثرات معاشرے کے زوال کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں بالخصوص خدا اور مذہب سے دوری اور بے تعلقی، معاشرے کی جسمانی، حیاتی اور نفسی طاقت کو زائل کردیتی ہیں۔ قوت عمل کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے۔ معاشرے کا صحیح ادراک سے قاصر رہ جانا سب سے بڑی لعنت ہے۔ چونکہ معاشرے کے لئے ایک طرف تو اس کے وظائف کی توسیع اور دوسری طرف قدمعنویت کے ارتباط کلی سے اس کے اعضاء کی صحت عمل ضروری ہے۔ اجتماعی توارثات اور خاندانی اور مذہبی روایات سے فائدہ اٹھانے میں اگر افراد قاصر رہ جائیں تو رفتہ رفتہ معاشرہ تنزل کرتے ہوئے مٹ جاتا ہے۔ اس فلسفہ کا نکتۂ اساسی یہ ہے کہ جس حد تک ہم بیماریوں سے پاک رہیں اور اپنی جسمانی اور نفسی زندگی کو بہتر بنائیں، اسی مناسبت سے معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو ترقی ہوگی۔ کیونکہ اعلیٰ اجتماعی زندگی اعلیٰ افراد پر ہی مشتمل ہے۔ [۴۵]

ابن خلدون جب اپنے مقدمہ میں برامکہ کی حکومت کے زوال کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ کچھ ایسی بنیادی خرابیاں اور نقائص ٹٹولتے ہیں جو موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں اور حکومتوں کی پہچان بن گئی ہیں۔ وہ برامکہ کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برامکہ کے زوال کا سبب یہی ہے کہ انہوں نے حکومت پر بالاستقلال اپنا قبضہ جمالیا تھا اور خزانہ اپنے قبضہ میں کرلیا تھا۔ اور حکومت کے بڑے بڑے اور کلیدی عہدے اپنے خاندانی رؤسا کو دے رکھے تھے اور دوسرے قابل اشخاص کو وزارت، کتابت وقیادت، حجابت اور سیف و قلم کے عہدوں سے محروم رکھا تھا۔ [۴۶]

جب کوئی ملک عروج پر پہنچ جاتا ہے وہ ملک خوشحال ہوتا ہے۔ اس ملک میں مالدار لوگوں کی کثرت ہوجاتی ہے جو رفتہ رفتہ اخلاق ذمیمہ اور بری عادات میں پھنس جاتے ہیں۔ عیاشی ایک حکمران کو سیاسی خوبیوں سے محروم کرتی ہے اور نتیجتاً ملک ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے جو لوگ سیاسی بصارت اور سیاسی خوبیوں سے عاری ہوتے ہیں۔ پھر جب یہ حرمان نصیبی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ملک ان کے قبضہ سے نکل کر دوسری قوم

کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جس میں سیاسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔[47] جب دنیا میں کوئی بڑا تغیر رونما ہو جیسے ملک کا مروجہ دین بدل جائے یا آبادی گھٹ جائے یا کوئی حادثہ پیش آجائے تو ایسی صورت میں بھی پوری قوم سے حکومت نکل جاتی ہے۔[48]

یہ حقیقت ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ مغلوب و مفتوح قوم جلد فنا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غلام قوم میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی آبادی گھٹ جاتی ہے اور لوگوں میں جذبہ کسب و سعی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے ذاتی دفاع پر بھی قادر نہیں رہتے ہیں، کیونکہ اقتدار ان کی شان و شوکت کی کمر توڑ دیتا ہے اور وہ ہر حملہ کرنے والی طاقت کے آگے سر تسلیم جھکا دیتے ہیں۔ اور ہر کھانے والے کے منہ کا نوالہ بن جاتے ہیں خواہ وہ حکومت کے بامِ عروج تک پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں۔[49]

جہاں تک عروج کا تعلق ہے ہر وہ قوم عروج پا سکتی ہے جو ان بیان کردہ نقائص کا وقتاً فوقتاً ازالہ کرتی رہے اور ہر وقت اپنے عمل کا حساب کرتی رہے۔ اگر کوئی قوم اپنے عمل اور اپنی روش کا احتساب کرنے سے غفلت کرتی ہے تو وہ قوم رفتہ رفتہ پستی کا شکار ہوتی ہے اور بتدریج ایسی قوم اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ ہر ایک قوم ایک خاص حد تک اپنے عروج کو پا سکتی ہے اور وہ خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد کچھ عرصہ تک قرار کرتی ہے۔[50] اور اس ٹھہراؤ کے بعد اس قوم پر بڑھاپے اور زوال کے آثار وارد ہوتے ہیں۔ پہلے یہ کمزور قوم اطراف و جوانب سے سمٹتی ہے اور مرکز محفوظ رہتا ہے اور پھر حکومت سمٹتے سمٹتے مرکز کو بھی لے ڈوبتی ہے۔[51]

دورِ حاضر میں جن دو تہذیبوں کے درمیان نمایاں کشمکش بتائی جاتی ہے وہ دو تہذیبیں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ ان دو تہذیبوں میں ایک تہذیب مسلط اور دوسری تہذیب اسکے زیرِ تسلط ہے۔ اسلامی تہذیب مغربی تہذیب کے نشانے پر ہے اور اسلامی تہذیب کے علمبرداروں میں مذکورہ اسبابِ زوال نمایاں نظر آتے ہیں۔ جبکہ مغربی تہذیب بھی رفتہ رفتہ جمود کی شکار ہو رہی ہے جو اسکے زوال پذیر ہونے پر دال ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حقیقی طور پر ان دو تہذیبوں کے

درمیان کسی قسم کا تصادم یا کشمکش جاری ہے یا کہ یہ محض پروپگنڈہ ہے تا کہ اس کی آڑ لے کر کوئی بڑا مفاد حاصل کیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ اوپر بیان کردہ اسبابِ عروج و زوال کی روشنی میں موجودہ تہذیبوں کے زوال اور عروج کو دیکھا اور پرکھا جائے اور پھر مذکورہ سوال کا جواب تلاش کریں۔

حواشی

1. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order*, Delhi, Penguin Books 1997, p.13.

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۱

۳۔ ایضاً، ص ۲۹

4. Samuel P. Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs*, Summer 1993.

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

7. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, Delhi, Penguin Books, 1997, p 34.
8. Samuel P. Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs*, Summer 1993.

۹۔ ایضاً

10. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, Penguin Books, 1997, p. 116.

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۱۷-۲۱۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۱۱-۳۱۲

18. Samuel P. Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs*, Summer 1993.

۱۹۔ ایضاً

20. Sameul P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, p. 321.
21. "Culture", *The Oxford English Dictionary*, Oxford, The Clarendon Press, 1933.

۲۲۔ "Culture"، قومی انگریزی اُردو لغت، مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔

23. "Culture", *The Oxford Encyclopaedic Dictionary*, London, Oxford University Press, 1983.
24. "Culture", *Webster's Third New International Dictionary*, ed. Philip Babcock Gove et al, 1965.
25. "Culture", *The Penguin Dictionary of Psychology*, revised by Harvey Waller Stein, Britain, Penguin Books, 1982.
26. "Culture", *The New Encyclopaedia Britannica*, 1988, Vol. 16, p. 874.

۲۷۔ سید قطب شہید، جادہ و منزل، مترجم: خلیل احمد حامدی، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۱۲۔

28. Ziauddin Sardar, *The Future of Muslim Civilization*, London, Mansell Publishing Limited, 1987, p. 296.

۲۹۔ ابن خلدون، مقدمہ مترجم: مولانا راغب رحمانی دہلوی، نئی دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، حصہ اول، ص ۱۳۸۔

۳۰۔ سید قطب شہید، جادہ و منزل، ص ۳۱۰-۳۱۱

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۱۱-۳۱۳

۳۲۔ "Civilization"، قومی انگریزی اُردو لغت، مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء نیز

"Civilization", *New Webster's Dictionary of the English Language*, Deluxe Encyclopaedic Edition, USA, Delair Publishing Company, 1971.

33. "Civilization", *Webster's Third New International Dictionary*, ed. Philip Babcock Gove et al, 1965.

۳۴۔ ایضاً

35. Ziauddin Sardar, *The Future of Muslim Civilization*, Lon., Mansell Publishing Ltd. 1987, p. 296.

۳۶۔ سید قطب شہید، جادہ و منزل، ص ۲۶۹-۲۷۰

37. M.M. Picthal, *Cultural Side of Islam*, Delhi, Kitab Bhawan, 1990, p.2.

۳۸. ڈاکٹر محمد علی خناوی، اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید، دہلی، ہندوستان پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۔
۳۹۔ سید ابوالاعلےٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۳۹۔

40. "Civilization", *The Encyclopedia Americana*, Grolier incorporated, USA, 1991.
41. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, New Delhi, Penguin Books, 1997, pp. 40-43.
42. Bertrand Russell, *Why I am Not a Christian*, London, Routledge, 2000, Preface.
43. Will & Ariel Durant, *The Story of Civlization: Our Oriental Heritage*, 1935, Vol. I, Part I.

۴۴۔ علامہ عبدالرحمن ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷، حصہ اول، ص ۱۹۸۔
۴۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸-۱۲۹
۴۶۔ ایضاً، ص ۱۷۶
۴۷۔ ایضاً، ص ۳۷۴
۴۸۔ ایضاً، ص ۳۷۹
۴۹۔ ایضاً، ص ۳۸۱
۵۰۔ ایضاً، ص ۴۰۴
۵۱۔ ایضاً

باب دوم

مغربی تہذیب - تاریخ کے آئینے میں

انسانی تاریخ کو سمجھنے کے لئے مغرب کے تاریخ دانوں نے اس کو کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اگر چہ ہر ایک قدیم دور کے بارے میں ہماری معلومات بالکل قلیل ہیں مگر اس تقسیم سے انسانی تہذیبوں کے ارتقاء و زوال کو سمجھنے میں کافی حد تک آسانی ہوتی ہے۔ سیدنا آدم اور سیدہ حوا علیہما السلام کے زمین پر آباد ہونے سے لیکر ہی انسانی تاریخ نے کئی موڑ لئے ہیں۔ مورخین انسانی تہذیب کو پتھر کے زمانہ (The Stone Age) سے مستقل اور مسلسل ارتقاء میں مانتے ہیں۔ اس انسانی تاریخ میں کئی تہذیبیں وجود میں آئی اور کئی ترقی یافتہ تہذیبیں بالکل نیست و نابود ہو گئیں۔ پتھر کے زمانہ کے بعد دھات کے زمانے (The Bronze Age) نے انسانی تاریخ میں تہذیبی ارتقاء کو کافی تیز کر دیا۔

چار ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے بابلی علاقوں میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو سچے دین کی طرف بلانا شروع کیا۔ اللہ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ بابلی علاقہ جات کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لایا جائے۔ مگر جب لوگوں نے ان کی مخالفت کی تو انہوں نے اور ان کے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حجاز میں توحید کے مرکز - کعبۃ اللہ - کی تعمیر کی جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند سیدنا اسحاق علیہ السلام نے فلسطین میں ایک اور مرکزِ توحید کی بنا ڈالی جسکو بیت المقدس یعنی مسجدِ اقصیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے سات سے زائد صدیوں پہلے روم کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اور

بعد میں آنے والی صدیوں میں روم نے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ روم کی بنیاد کے بعد ہی ایران میں زرتشت (Zoroaster)[تقریباً ۶۲۸ ق م-۵۵۱ ق م] نمودار ہوا۔ تقریباً اسی صدی میں چین میں کنفیوشیس (Confucius) [۵۵۱ ق م۔ ۴۷۹ ق م] اور Lao Tse (۶۰۴ ق م-۵۲۱ ق م) اور ہند میں گوتم بدھ (۵۶۳ ق م۔۴۸۳ ق م) نے اپنے اپنے فلسفہ کی بنیاد ڈالی۔ آنے والی صدیوں میں اس فلسفہ کو سقراط (۴۷۰ ق م-۳۹۹ ق م)، افلاطون (۴۲۷ ق م-۳۴۷ ق م) اور ارسطو (۳۸۴ ق م-۳۲۲ ق م) نے یونان میں ترقی دی۔ اسی اثنا میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی اور انہوں نے انسانی معاشرہ کی اصلاح کی دعوت دینی شروع کر دی۔

۴۷۶ء میں یورپ میں قرون وسطیٰ شروع ہوا۔ کلیساء نے اپنی 'رُوحانی قیادت' میں دنیوی طاقت کو شامل کیا اور اس طرح کلیساء معاشرہ کی سوچ و زیست پر مسلط ہو گیا۔ اسی دوران یورپ قتل و غارت، قومی و نسبی رسہ کشی اور جہالت کی وجہ سے قرون مظلمہ (Dark Ages) میں غرق ہوا۔

اس کے بعد ۵۷۱ء میں عرب میں سیدنا محمد ﷺ پیدا ہوئے اور ۶۱۰ء میں بحیثیت رسول مبعوث کیے گئے۔ ۶۳۷ء میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس فتح کرتے ہیں۔ ۷۱۱ء میں طارق بن زیاد اسپین فتح کرتے ہیں۔ ۸۳۰ء میں خلیفہ المامون بیت الحکمہ کے نام سے ایک دارالترجمہ کھولتے ہیں جس کا کام یونانی کتب کو عربی زبان میں منتقل کرنا تھا۔

۱۰۹۵ء میں عیسائی پوپ اربن پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کرتا ہے۔ ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد واقع ہوتا ہے اور تاتار بغداد میں عباسی حکومت کا خاتمہ کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مشرق میں اسلام نے بڑی سرعت کے ساتھ پھیلنا جاری رکھا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فتح نے استنبول کو فتح کیا اور پوری دنیا میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ یورپ میں نئے ممالک -انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا- نے اپنی اپنی سلطنتوں کو پھیلانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کیا۔ قطب نما کی ایجاد سے بحری جہازوں نے بحرِ اطلانتق کو عبور کر کے

۱۴۹۲ء میں امریکہ کو دریافت کیا۔ یورپ میں فکر اور سائنس کے نشاۃ ثانیہ نے یورپ کے بین الاقوامی تعلقات میں اس وقت تک نئی جہت قائم رکھی جب تک ۱۷۸۹ء میں فرانس میں فرانسیسی انقلاب نے اس دور کو ختم نہیں کیا۔ اس کے بعد صنعتی دور کا آغاز ہوا اور اس نے پوری طرح یورپ کے نقشہ کو بدل کے رکھ دیا۔ انیسویں صدی میں ایجاد پر ایجاد ہونے لگی۔ دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یورپ نئے اور جدید دور میں داخل ہوا۔ مسلم ممالک غلام بنائے گئے۔ کچھ کو ظاہراً آزاد کیا گیا مگر ان کو اقتصادی، فوجی اور تہذیبی طور پر مفلوج بنا کر چھوڑا گیا۔ بیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کی لہر دوڑی مگر اس کو ہر جگہ کچلا گیا اور نتیجتاً دونوں تہذیبیں اعلانیہ طور پر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء نظر آنے لگیں اور اسی صف آرائی کو مغرب نے 'تہذیبی تصادم' کا نام دینے کی کوشش کی ہے اور اس نام کی آڑ میں مشرق پر یلغار کرنے کا ارادہ مزید مستحکم کیا ہے۔

مغربی تہذیب کو لفظ ''مغرب'' سے موسوم کرنا بذاتِ خود صحیح نہیں کیونکہ اس سے ایک مبتدی اس فریب کا شکار ہوتا ہے کہ شاید دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک مغرب اور دوسرا مشرق۔ ہمیں اس امر سے بخوبی واقف ہونا چاہیے کہ مغرب و مشرق بذاتِ خود کوئی جغرافیائی اصطلاح نہیں بلکہ اس کا اطلاق اس طرزِ زندگی اور فلسفہ حیات پر ہوتا ہے جو ایک مخصوص کردار (Character) اور کچھ منفرد عناصر اپنے اندر رکھتی ہے۔ جبکہ مشرقی تہذیب کی اصطلاح بھی کچھ خاص عناصر اور مخصوص نظریۂ حیات رکھنے والی تہذیب پر فٹ آتی ہے۔ یہ اصطلاحات جغرافیائی حدود کی قید سے بالکل آزاد ہے اور یہ عملاً واضح ہے کہ مغربی دنیا میں مشرقی تہذیب پنپتی ہے اور اسی طرح مشرقی دنیا میں بھی مغربی تہذیب قائم ہو سکتی ہے۔

جہاں تک مغربی مفکرین کا خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغربی تہذیب کا ظہور تقریباً ۷۰۰ یا ۸۰۰ عیسوی سے شروع ہوا۔ مغربی محققین کے مطابق مغربی تہذیب کے مندرجہ ذیل تین بڑے اجزاء ہیں:

۱۔ لاطینی امریکہ

۲۔ شمالی امریکہ

۳۔ یورپ

لاطینی امریکی باشندے مذہبی طور پر کیتھولک ہیں۔اس کی سیاسی اور اقتصادی ارتقاء شمالی اطلانٹقی ممالک کے نہج سے مختلف ہیں۔اس کی دیسی ثقافت یورپی ثقافت سے بالکل جدا ہے۔تاریخی طور پر مغربی تہذیب یورپی تہذیب ہے۔شمالی امریکہ لاطینی امریکہ سے ثقافتی بنیادوں پر مختلف بھی ہے۔[1] پھر بھی یہ سب ثقافتیں مغربی تہذیب کا حصہ ہیں۔مذکورہ نظریہ زیر بحث مسئلہ تہذیبی تصادم کے بانی سموئیل نے پیش کیا ہے جبکہ دوسرے مفکرین اور محققین کا نظریہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا ظہور صرف ۷۰۰ یا ۸۰۰ عیسوی میں نہیں ہوا ہے بلکہ مغربی تہذیب یونانی اور رومی تہذیب کی جدید صورت ہے۔سموئیل بھی اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں یونانی فلسفہ وعقلیت، رومی قوانین وغیرہ شامل ہیں۔[2]

جہاں تک مغربی تہذیب کے بنیادی عناصر کا تعلق ہے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد یونانی فلسفۂ مادیت، رومی اخلاق، سیاست اور معاشرت پر ہے۔چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں رومی سلطنت عیسائی سلطنت میں تبدیل ہوئی۔بادشاہ قسطنطین (تقریباً ۲۸۰ء-۳۳۷ء) نے بظاہر عیسائیت قبول کی اور نتیجتاً رومی سلطنت جس کی ذہنی آب وہوا یونانی فلسفہ پر مبنی تھی، نے عیسائی مذہب کو بالکل بدل کر یونانی فلسفہ اور رومی طرز حیات بنادیا۔جس کو پولس (تقریباً ۴ ق م-۶۸ عیسوی) سے منسوب کرنا زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور اس انتساب کی بناء پر اس کو ''پولوسیت'' کہنا بہتر ہے۔[3] اس طرح جدید عیسائی مذہب مغربی تہذیب کا ایک بنیادی جز بن گیا۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب اصل میں تین بنیادی اجزا رکھتی ہیں۔

۱۔ یونانی فلسفہ

۲۔ رومی ادارہ جات اور طرزِ زندگی

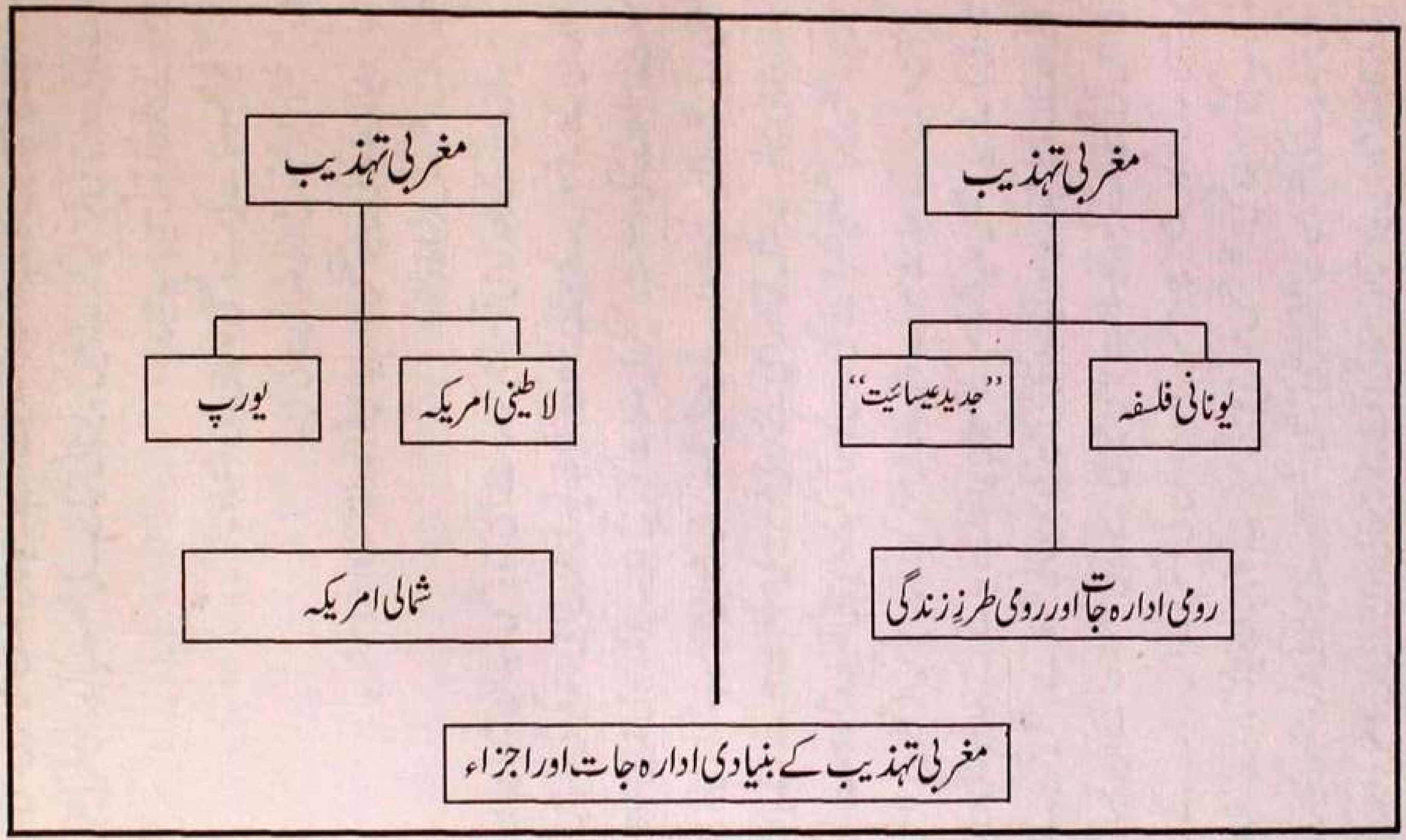

[مقابل صفحہ نمبر ۲۶]

۳۔ جدید عیسائیت (پولوسیت)

یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز ''مادیت'' ہے۔ یونانی فلسفہ، شاعری، حتیٰ کہ مذہب، سب مادی روح کی غمازی کرتے ہیں۔ یونانی تہذیب کی خصوصیات جو مغربی تہذیب کے اجزاء کے بطور نظر آتی ہیں، یہ ہیں:

۱۔ غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲۔ خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمامِ شدید۔

۴۔ حبِ وطن میں افراط وغلو[۴]

یونانیوں کے بعد رومی قوم اُبھر کر سامنے آئی۔ وہ علمی میدان میں یونان کے مخلص مقلد بن گئے۔ انہوں نے یونانی ''مادی'' فلسفہ پوری طرح اپنی زندگی کی اساس بنا کر تنظیمِ مملکت، سلطنت کی وسعت، عسکری صفات کو ترجیح دی۔ چونکہ رومی مذہبی لحاظ سے راسخ العقیدہ نہ تھے، اس لئے انہوں نے یونانی فلسفہ کو ہی بطور اپنا مذہب قبول کیا۔ چونکہ یونانی فلسفہ روحانی پہلو سے خشک تھا اور اسی لئے رومی قوم بڑی سلطنت ہونے کے باوجود روحانی طور پر بالکل غیر مطمئن نظر آنے لگی۔ ان کا درآمد کیا ہوا یونانی فلسفہ وعلم وحکمت ان کو روحانی تسکین دینے کے بجائے صرف ذہنی غذا فراہم کرتا تھا۔ پولس (تقریباً ۴ ق م۔ ۶۸ عیسوی) نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد عیسائی دینیات سے کافی حد تک چھیڑ چھاڑ کی اور ایک ایسی نئی تعبیر کی جو یونانی فلسفہ کے بالکل قریب تھی۔ پولس کی اس نئی تعبیر کے بعد عیسائیت بڑی تیزی سے رومی سلطنت کے ان غیر مطمئن اور پریشان حال لوگوں میں پھیلنا شروع ہوئی جن کی اکثریت اس زمانے کے دیگر باطنی مذاہب کی گرویدہ تھی۔[۵] جس طرح یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز ''مادیت'' تھا اسی طرح رومی تہذیب کی خصوصیت ''خودغرضی'' تھی۔ شہنشاہیت پسندی اور استعماری روح ان کی زندگی کا نقطہ نگاہ بن چکا تھا اور اخلاقی انحطاط اور حیوانی ہوس رانی ان کا طرزِ زندگی بن گیا۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب میں یہ کردار (Characters) پوری طرح ابھر کر نظر آتے ہیں۔

اگر موجودہ عیسائیت کو بغور جانچا اور پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ عیسائیت نے پوری طرح یونانی مادیت اور رومی خودغرضی واستعماری روح کو قبول کر کے اپنی پہچان پر یونانی فلسفہ اور رومی ادارہ جات کو مسلط کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ربّانی دین -'عیسائیت-' غیر الٰہی فلسفہ اور رومی طرزِ زندگی سے اس قدر مل گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے کی خصوصیات اور امتیازات کو یکسر بدل دیا اور آخرالذکر اول الذکر پر غالب آئے۔ اسی لئے Amold Toynbee نے عیسائی تہذیب کو یونانی و رومی تہذیب کا ملغوبہ کہا ہے۔[۲]

یہ امر بھی اظہر من الشمس ہے کہ تحریک اسلامی کے ظہور کے بعد دو عظیم تہذیبیں- رومی تہذیب اور ساسانی تہذیب- اسلامی سیلاب کے آگے ٹھہر نہ سکیں اور دونوں تہذیبیں دبی رہی۔ مگر یہ قطعاً ممکن نہیں کہ کوئی تہذیب یا مذہب پوری طرح دوسری تہذیب یا مذہب کو یک دم نابود کرے بلکہ مغلوب تہذیب ہمیشہ نئی صورت میں دنیا میں نمودار ہوتی ہے۔ چونکہ عیسائیت نے رومی تہذیب میں نئی روح پھونکی تھی اس لئے رومی تہذیب، یونانی فلسفہ اور عیسائیت ایک دوسرے کے لئے بحیثیت لازم وملزوم ابھر کر سامنے آئے اور دنیا کے جس جس علاقہ میں عیسائیت داخل ہوئی وہاں رومی اور یونانی تہذیبوں کے عناصر بھی پروان چڑھے اور جس جس علاقہ میں رومی اور یونانی طرزِ حیات اور فلسفہ وارد ہوا وہاں آگے چل کر عیسائیت بھی خوب پھیلی۔ غرض مغربی تہذیب کے تین بنیادی عناصر ایک دوسرے کے لئے راہ ہموار کر کے تمام غیر مغربی تہذیبوں کو سرنگوں کر رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کی یلغار

اسلام کی آمد کے بعد رومی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور اس طرح یونانی فلسفہ اور رومی ادارہ جات اور طرزِ زندگی دنیا میں قیادت کے منصب سے محروم ہوئے۔ اسلامی تہذیب

نے دنیا کی قیادت وامامت سنبھالی۔ ۸۱۳ء میں المامون نے جب خلافت سنبھالی تو یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا جانے لگا۔ ۸۳۰ء میں بیت الحکمۃ کے نام سے بغداد میں ایک دارالترجمہ کھولا گیا جس میں یونانی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی ایک منظم تحریک شروع کی گئی۔ جس سے یونانی فلسفہ محفوظ ہوگیا۔ اسلامی خلافت کے دوران رومی سلطنت کی پراگندگی اور مسلمان خلفاء کی برتری کا احساس اس خط سے بھی ہوتا ہے جو خط روم کے بادشاہ نقفور اول (۸۰۲ء۔۸۱۱ء) نے اپنی ماں کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کے شروط کو مسترد کرتے ہوئے لکھا تھا اور جس میں مسلم خلفاء سے اس فدیہ کا تقاضہ کیا گیا تھا جو روم نے اس سے قبل ادا کیا تھا۔ ہارون رشید نے اس رومی بادشاہ کے مطالبات کے جواب میں اس کے خط کے پیچھے یوں جواب لکھا تھا:

> ''امیر المومنین ہارون کی طرف سے۔ رومی کتے نقفور کے نام سے۔ تحقیق میں نے تیرا خط پڑھا۔ رہا جواب، وہ تیری آنکھوں کو دکھا دیا جائے گا، کانوں کو سنایا نہیں جائے گا۔''[۷]

بیت المقدس جو عیسائیوں کے لئے مقدس زیارت تھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور (۶۳۷ء) میں فتح ہوا تھا۔ ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن دوم (۱۰۸۸-۱۰۹۹) نے باضابطہ اعلان جنگ کر کے پوری عیسائی قوم کو مسلمانوں کے خلاف منظم کیا۔ یہ اعلان پوری طرح مذہبی نوعیت کا تھا:

> ''ان کافروں سے جنگ کرو جو مسیح کی خانقاہ پر قابض ہوگئے ہیں۔ تم میں سے جو بھی اس جنگ میں شریک ہوگا اس کے سارے پچھلے گناہ معاف کردوں گا۔ تم میں سے جو مارا جائے گا اسے بہشت میں جگہ دوں گا۔''[۸]

۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء میں عیسائی صلیبیوں نے پہلی صلیبی جنگ میں بیت المقدس پر قبضہ جمایا۔ اس کے بعد ۴ جولائی ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں سے بیت المقدس واپس حاصل کیا۔ تقریباً دو صدی تک یورپ نے مسلسل صلیبی جنگوں کے ذریعہ بیت المقدس کو حاصل کرنا چاہا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ صلیبی جنگ پہلا موقعہ تھا

جب عیسائی دنیا جدید مغربی تہذیب کے بھیس میں اسلامی تہذیب کے سامنے آئی۔ یہ وہ موقعہ تھا جب اسلام کے پھیلنے اور رومی سلطنت کی دنیا پر بالادستی ختم ہونے کے بعد پہلی بار عیسائی یورپ (مغرب) نے اسلامی دنیا پر حملہ کرنے کی جرأت کی اور پہلی صلیبی جنگ میں احساس برتری کے ساتھ مسلم علاقہ جات پر قبضہ بھی جمایا۔ پہلی صلیبی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد یورپ نے تقریباً ۸۸ سال تک مسلم یروشلم پر حکومت کی اور اسلامی تہذیب سے پہلی مرتبہ ایک طویل عرصہ تک براہِ راست قریب رہی۔ اس دوران یورپ نے تہذیبی سطح پر پہلی دفعہ اسلامی تہذیب سے استفادہ کیا۔ چونکہ اسلامی تہذیب پوری دنیا کی قیادت کر رہی تھی اور یورپی تہذیب، ان دنوں احساس کہتری اور احساسِ کمتری سے دوچار تھی، نے پوری طرح اسلامی تہذیب سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کوئی تہذیب اسلامی تہذیب سے دینی پہلو سے متاثر ہوئے بغیر استفادہ کر رہی تھی۔ فرانسیسی یروشلم پر غالب آئے تھے مگر اس کے باوجود وہ ذہنی طور پر اس طرح اسلامی تہذیب سے مرعوب تھے کہ انہوں نے یورپی لباس کی جگہ یروشلم میں رائج مشرقی لباس پہننا قبول کیا ان کے کھانے اور مکان مشرقی طرز کے بننے لگے۔ اگرچہ تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے وہ اسلامی دنیا کے کافی قریب آئے مگر انہوں نے اسلام دشمنی سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا۔

> ''ایک مہینہ سے کم وبیش تک [یروشلم] کا محاصرہ کرنے کے بعد آخر کار اس شہر پر (۱۵ جولائی کو) قبضہ کیا گیا۔ قتلِ عام بہت ہی خوفناک تھا۔ مفتوحین کا لہو گلی کوچوں میں بہ رہا تھا۔ جب آدمی ان گلیوں میں سوار ہو کر گزرتے تو وہ خون میں لت پت ہو جاتے تھے۔ رات ہوتے ہی۔۔۔ صلیبی مرقدِ مسیح (Sepulchre) کے کلیسا۔۔۔ میں آئے اور خون سے رنگے ہاتھوں کو اپنی نماز میں جوڑا۔''[9]

علوم کیمیا، طب، ہیئیات، ریاضی اور فلسفہ وغیرہ میں یورپ نے مسلمانوں سے استفادہ تو کیا مگر اسلام دشمنی اور تعصب کی وجہ سے اسلامی اخلاق سے بالکل عاری رہے۔ فن تعمیر، صنعت وحرفت، تجارت وغیرہ میں مسلمانوں کی تقلید تو کی مگر مسلمانوں پر تشدد بھی

جاری رکھا۔اس ''لین دین'' کی وجہ سے پہلی بار مشرق اور مغرب کے درمیان تعلقات نے مسلمانوں کو یورپی تہذیب سے پوری طرح متنفر کر دیا۔ان جنگوں نے مشرق و مغرب کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جواب تک نہ مٹ سکی۔ان صلیبی جنگوں کے دوران جو یہودی یروشلم میں مسلم خلافت کے سائے میں آباد تھے وہ بھی یورپی یلغار کی بھینٹ چڑھ گئے۔عیسائیوں نے تمام مسلمانوں، مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کا بھی قتلِ عام کیا۔[۱۰] ہر طرف لوٹ مار مچائی گئی۔سات صدیوں سے زیادہ عرصہ تک اس مقدس شہر پر حملے کیے گئے مگر فلسطین مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔اور عجیب معاملہ اس وقت پیش آیا جب ۱۹۶۷ء میں یورپ کی امداد سے ہی یہودیوں نے اس مقدس شہر پر قبضہ کیا۔

صلیبی جنگوں نے مشرق و مغرب کو پہلا موقعہ فراہم کیا تھا کہ وہ براہِ راست ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے مگر یہ موقع اس قدر تلخیوں کی نذر ہوا کہ اس سے ترقی کے بجائے سموئیل کی زبان میں ''تہذیبی تصادم'' کی وجہ سے قتل و غارت اور مسلسل جنگ و جدل نے جنم لیا۔اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تہذیبی تصادم نہیں بلکہ مغرب کی طرف سے تہذیبی تسلط تھا کیونکہ:

۱۔ یورپ پر ان دنوں تاریکیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے قانونِ قدرت کے برعکس مسلمانوں کے خلاف بربریت، سفاکی، جنون، عداوت کا کھلم کھلا اظہار کر کے اسلامی تہذیب پر اعلانیہ حملہ کیا۔چونکہ اسلامی تہذیب ان دنوں ترقی یافتہ تھی اور ہر لحاظ سے مدافعانہ صلاحیت رکھتی تھی اس لئے اس تہذیب سے مغربی بربریت برداشت کرنے کی امید رکھنا صحیح نہیں۔

۲۔ صلیبی جنگیں مسلمانوں پر تھوپی گئی اور ان میں عیسائیوں کی طرف سے سیاسی سوجھ بوجھ کے بجائے پادریوں اور پوپ کے مذہبی جنون کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔جس وجہ سے ان کی فوجیں غیر منظم اور وحشی ثابت ہوئی یہاں تک کہ وہ انسانی گوشت بھی بطور خوراک استعمال کرنے لگے تھے۔جب کہ ان کی مدِ مقابل تہذیب ایک مہذب تہذیب تھی اور

جنگ میں بھی قوانین اور اصول کی پاسداری کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائی صلیبیوں سے فدیہ لیکر اور کئی ہزار غریب صلیبیوں کو بغیر فدیہ آزاد کیا جبکہ رچارڈ (Richard) نے فدیہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ۲۷۰۰ مسلم جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصل میں یہ دو ہم پلہ تہذیبوں کے درمیان تصادم نہیں تھا بلکہ یہ ایک وحشی اور جاہل تہذیب کی طرف سے ایک مہذب تہذیب پر کھلم کھلا یلغار تھی جس کا مقصد تسلط اور استبداد تھا۔ اس لئے اس یلغار کے ردِ عمل میں کی گئی کارروائی قطعاً بے وجہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک مظلوم قوم کی طرف سے اپنے حقوق کے دفاع کا عملی مظاہرہ تھا۔

پہلی یلغار کے بعد ۱۴۹۲ء میں دنیائے اسلام میں اس وقت ایک عظیم سانحہ پیش آیا جب تقریباً ۸۰۰ سال بعد غرناطہ (اندلس) مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر عیسائی مغرب کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ۷۱۱ء میں موسیٰ ابن نصیر نے اسپین پر فوج کشی کی تھی اور تقریباً ۸۰۰ سال تک اسپین پر مسلمانوں نے حکومت کی۔ اسلامی تہذیب میں اسپین ایک سنہری باب مگر نہایت ہی تلخ تجربہ ہے۔ مسلمانوں کی خانہ جنگی اور اندرونی انتشار کی وجہ سے عیسائیوں نے مسلم اسپین کو اس طرح حاصل کیا کہ اسپین میں مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اسلامی تہذیب کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے عیسائی حکمرانوں -فرداننڈ (Ferdinand) اور ازبلا (Isabella)- نے مسلمانوں کو جبری عیسائی بنانے کی تحریک شروع کی۔ عربی کتابوں کو جلایا گیا۔ جو مسلمان عیسائی بننے کے لئے تیار نہ ہوئے ان کو قتل کیا گیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا جب مغرب نے اسلامی دنیا کے ساتھ آنکھیں ملا کر اس کو پوری طرح ہلا کے رکھ دیا۔ اندلسی ثقافت و تمدن اسلامی تہذیب میں سب سے اہم اور روشن باب مانا جاتا ہے۔ اندلس علوم و فنون کے لحاظ سے پوری دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اندلسی فن تعمیر اور صنعتی ترقی عروج پر تھی مگر جب عیسائی مغرب کو اندلسی اسلامی کلچر سے ملاپ کا موقعہ ملا تو اس سے استفادہ کرنے اور اس کو ترقی دینے کے بجائے تعصب کے نتیجہ کے طور پر اسپین سے اسلام کو پوری طرح نیست و نابود کیا گیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ مغربی تہذیب نے پوری جرأت کے ساتھ

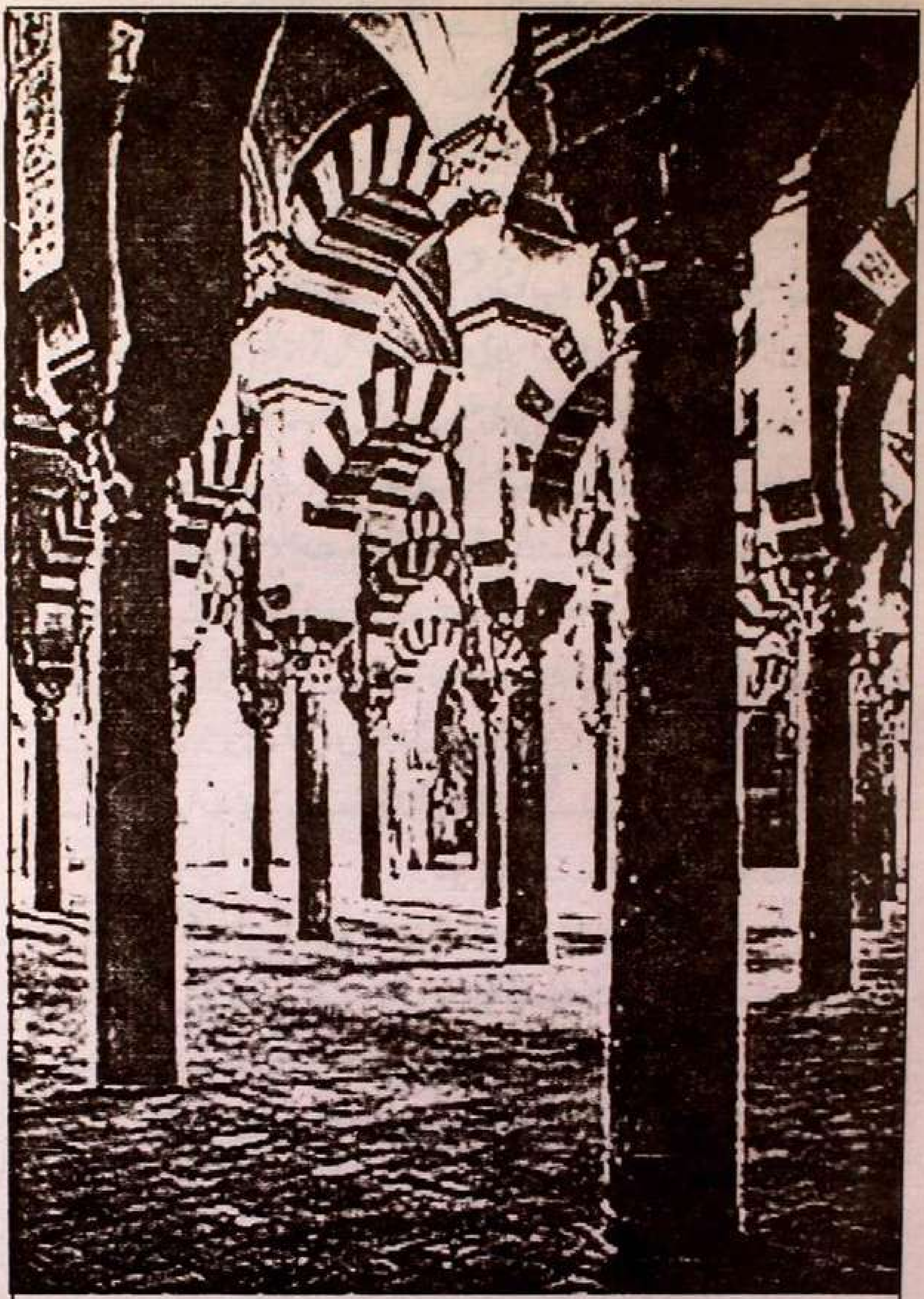

مسجدِ قرطبہ- اسلامی اسپین (اندلس) کی پہچان

[مقابل صفحہ نمبر ۳۲]

ایک اعلیٰ تہذیب پر حملہ کر کے اس کو ایک جگہ سے بالکل ختم کیا۔ گو یہ بھی کوئی قدرتی تہذیبی تصادم نہ تھا بلکہ کھلم کھلا جارحانہ تہذیبی حملہ تھا۔ اس تہذیبی حملہ کے عقب پر عیسائی مذہبی جنون اور تعصب کارفرما تھے۔ اس لئے اس کو قانون فطرت کے بجائے انسانی جارحیت سمجھنا چاہیے۔

تاریخِ اسلام میں اسلامی تہذیب کو تین قسم کے تجربوں سے گزرنا پڑا ہے۔ پہلا تجربہ دوسری صدی ہجری میں پیش آیا جب اسلامی تہذیب بالکل توانا اور تازہ دم تھی۔ اسلامی تہذیب احساس کمتری سے محفوظ تھی اور پوری طرح پر جوش فاتحانہ روح رکھتی تھی۔ اس کے بالمقابل دنیا کی دو عظیم تہذیبیں تھیں۔ ایک مغرب کی بازنطینی (رومی) تہذیب اور دوسری مشرق کی ساسانی (فارسی) تہذیب۔ دونوں تہذیبیں معاشرت، علوم وفنون اور ثقافت کے لحاظ سے ترقی یافتہ تھیں اور اسلامی معاشرہ مرعوبیت کے مرض سے محفوظ ہونے کے ساتھ خود اعتمادی سے بھی لبریز تھا۔[11] ذہنی غلامی اور احساس کہتری بالکل مفقود تھی۔ اس لئے مسلمانوں نے خذما صفا و دع ماکدر کے اصول کے مطابق جو کچھ اپنے لئے مناسب سمجھا اس کو اپنے اسلامی سانچے میں ڈھال کر اپنی تہذیب میں فٹ کیا اور جس کے بارے میں کوئی خدشہ محسوس ہوا اس سے پرہیز کیا۔

دوسرا تجربہ اس وقت پیش آیا جب ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے عالم اسلام کے مرکز پر قبضہ کر کے ان کو سیاسی طور پر غلام بنایا۔ چونکہ اسلامی تہذیب اس وقت پوری طرح دنیا پر بالادستی رکھتی تھی اور حملہ آور وحشی اور بالکل جاہل تھا اس لئے وہ اسلامی تہذیب وثقافت سے بالکل متاثر ومرعوب ہو کر احساس کمتری اور احساس کہتری کا شکار ہو کے سیاسی طور پر غالب ہونے کے باوجود مغلوب تہذیب میں ڈھل کر اسلام کے محافظ بن گئے۔[12] دولتِ اسلامیہ تاتاریوں کے اس حملہ کے بعد پھر منظم ہوئی اور اس طرح ترقی کی راہ پر دوبارہ گامزن ہوئی کہ یورپ کو اسلامی دنیا سے پھر خطرہ محسوس ہونے لگا اور اس طرح پرانی ''صلیبی نفرت'' جدید لباس میں پھر اُبھر کر دنیا کے سامنے آئی۔ یہ قانونِ قدرت کے بعد

دولت اسلامیہ کے زوال کی دوسری وجہ تھی۔[۱۳]

تیسرا تجربہ اس وقت پیش آیا جب ترکوں نے عالم اسلام کی باگ دوڑ سنبھالی۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے مسلمانوں میں نئی روح پھونکی۔ پورا عالم اسلام ترکوں میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی کے آثار دیکھنے لگا۔ ترک پوری طرح توانا اور جنگجوانہ طبیعت رکھتے تھے اور پُر اعتماد نظر آتے تھے۔ وہ عسکری میدان اور علوم وفنون میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو ہی رہے تھے کہ ان کو اخلاقی انحطاط اور اندرونی رسہ کشی نے آگیرا۔ جہاد و اجتہاد زوال پذیر ہونے لگے۔ مسلمان ان دو عظیم صلاحیتوں سے عاری ہونے لگے۔ عباسی دور میں جو ترجمہ کی تحریک اُٹھی تھی وہ تحریک ٹھنڈی پڑنے لگی۔ دینی اور دنیوی علوم الگ الگ کئے گئے۔ مدارس جدید علوم سے خالی رکھے گئے۔ سائنس اور دیگر جدید علوم سے دامن بچایا گیا۔ مسلم قوم عرب اور ترک ناموں پر بٹ گئی اور کمزور ہونے لگی۔ ادھر مغرب میں سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ایجادات اور دریافتیں ہو رہی تھیں۔ اس دور میں یورپ میں سائنس دانوں اور محققوں کی ایک بڑی جماعت نے یورپ کو طویل غفلت سے بیدار کرنا شروع کیا۔ کلیسا مصلحتاً جزوی طور پر سیاست سے الگ ہونے پر راضی ہوا مگر اس کی گرفت تعلیم ونصاب پر باقی رہی اور انہوں نے اپنے مدارس میں سائنس وجدید فلسفہ کو داخل کیا جبکہ مسلمان اس دور میں غفلت اور ذہنی افلاس کی وجہ سے اجتہاد سے اس طرح دستبردار ہوئے جیسے اس کا حکمِ تحریمی اللہ نے نازل کیا ہو۔ چونکہ اس وقت دنیا کی قیادت ترکوں کے ہاتھ میں تھی، اس تجربہ میں ترکوں نے اپنے ذہنی افلاس اور مرعوبیت کا کھلم کھلا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اس قدر احساس کمتری کا اظہار کیا کہ ترکی اپنے تابناک ماضی سے شرم محسوس کرنے لگی اور اپنی عزت مغرب کی ذہنی غلامی میں دیکھنے لگی۔ ترکوں کے زوال کے بعد دنیا کی قیادت مغرب کے ہاتھ میں آئی اور اس طرح آج کا جدید مغرب اپنے تین بنیادی عناصر یونانی فلسفہ، رومی ادارہ جات وطرزِ زندگی اور جدید عیسائیت کا ملغوبہ بن کر دنیا پر مسلط ہوا۔ مغرب سے مشرق تک کوئی ملک ان کے اثر ونفوذ سے خارج نہ رہا، قومیں یا تو

مادی اور سیاسی حیثیت سے ان کی غلام اور زیر فرمان ہوگئی یا ذہنی یا علمی اور تہذیبی حیثیت سے زیر اثر اور زیر اقتدار رہی۔[۱۴]

ان تینوں تجربوں کے علاوہ ایک اور تجربہ اس وقت پیش آیا جب ۲۵ جولائی ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ (Napoleon Bonaparte) نے مصر پر قبضہ جمایا۔ اگرچہ یہ تسلط صرف تین سال اور چھ ماہ تک قائم رہا مگر اس تسلط نے آگے چل کر انیسویں صدی میں مصر کو "جدیدیت" کے نام پر مغرب کے کافی قریب لاکر چھوڑا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے ثابت ہوئے کہ مصر مغربی تہذیب کے کافی قریب آیا۔ اگرچہ اس تسلط نے مصر کو غفلت سے بیدار کیا مگر فرانسیسی انقلاب کے نظریات نے مصری نوجوانوں اور مفکروں کو کافی حد تک متاثر بھی کیا۔ نپولین محض ایک استعماری نوآبادکار تھا جو بذاتِ خود مغرب کا حصہ ہونے کے باوجود ہندوستان پر قابض یورپ کے خلاف اور ٹیپو سلطان رحمۃ اللہ علیہ کی حمایت کے لئے کھڑا ہوا مگر دوسری طرف وہ مملوک کی مخالفت اور عثمانیوں کی حمایت کے دعوے بھی کر رہا تھا۔ غرض فرانس کا یہ فوجی حکمران اسلامی علاقہ جات کو فرانس کی توسیع کے لئے ہڑپ کر رہا تھا اور اپنے اوپر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر محکوموں کے دل جیتنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا جس کو علماء مصر نے وقت پر بے نقاب کیا۔

نپولین کے خواب مملوکوں کی کمزوری اور ترکوں کی غفلت کی وجہ سے پورے ہونے کو تھے مگر علماءِ مصر نے اجتہاد سے کام لیکر جہاد کا اعلان کر کے نپولین کو مصر چھوڑنے پر مجبور کیا اور اس کے بعد ترکی فوج کے نوجوان افسر محمد علی نے مصر کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لی اور جدید مصر کی بنیاد ڈالی۔

مغرب کے عروج کے اسباب اور اس کے نتائج

مغرب کے عروج کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کے زوال کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ مغرب کا ارتقاء ٹھیک اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے مسلم قوم میں

زوال شروع ہوا۔ سب سے پہلے مغربی کشمکش کی ابتداء صلیبی جنگوں سے ہوئی۔ اس کے بعد مغرب نے انیسویں صدی میں سیاسی اور اقتصادی مفادات کے لئے اپنی سرحدوں میں جبراً وسعت دے کر پوری دنیا میں نوآبادیاں (Colonies) تلاش کرنا شروع کی۔ چونکہ مسلمانوں میں زوال کے آثار پہلے ہی نمودار ہوئے تھے مسلمانوں کی بالادستی دن بدن کمزور پڑ رہی تھی اور مسلمان اندرونی انتشار وغیرہ کے بھی شکار ہو رہے تھے، اس لئے مقابلہ دو غیر مساوی اقوام کے درمیان تھا، جن میں ایک قوم تازہ دم اور پر جوش تھی۔ جبکہ دوسری قوم کمزور، مایوس اور احساس کمتری سے سرشار تھی۔ اسلئے مغرب بہ آسانی مشرق پر اپنی گرفت کستا گیا اور نتیجتاً مشرق ایک پرخلوص غلام کی طرح ایک ظالم آقا کا سیوک اور خدمت گار بن گیا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ یقیناً مشرقی اقوام کے لئے بالعموم اور مسلم ملت کے لئے بالخصوص بہت ہی مہنگی ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف مشرق کو اپنا غلام بنادیا بلکہ ان کو اسقدر ذہنی فرسودگی اور ذہنی تنزل میں مبتلا کیا کہ مسلم ملت ہر ایک شے میں یورپ کی تقلید کرنے کے لئے خود بخود تیار ہوئی، اور اپنی اصلی تہذیبی روح یعنی اسلام کو ہی اپنی زندگیوں سے معدوم کرنے پر تل گئی۔

مغرب میں نشاۃ ثانیہ سے زندگی روحانیت سے خالی ہونے لگی اور ہر ایک فرد یونانی فلسفہ کے اثر سے مادی مفادات کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھنے لگا۔ مادیت انسان کے خیالات، احساسات، روح، فکر، علم اور نظر کا مرکز بن گئی۔ سیاست فریب و دھوکہ اور عہد شکنی و معاہدہ شکنی میں تبدیل ہوگئی، سائنس اور ٹیکنالوجی تباہ کاری اور استبداد کے دیو کی صورت اختیار کرنے لگے۔ فرائڈ (Freud) کے نظریۂ جنس (Sex Theory) کو انسانی زندگی کی اصل اور جوہر قرار دیا گیا، ایک عورت کی عفت اور پاکدامنی کی قدر و قیمت کا احترام دقیانوسیت تصور کی جانے لگی، بے حیائی اور برہنگی کو فن کا نام دیا جانے لگا، ہوس کو ابھارنے والے افسانوں کو ادب کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ [۱۵]

مادیت کی سب سے بڑی تباہ کاری یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے ہر ایک شعبہ

سے اخلاقی اور روحانی اقدار کو بے دخل کیا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کو ایک عظیم تسکین و فرحت سے محروم ہونا پڑا ہے۔[16] مادیت کی وجہ سے اقتصادیات بے انصاف دیو میں بدل گئی۔ انسان محض ایک سماجی حیوان (Social Animal) رہ گیا ہے۔ اس فلسفۂ خود غرضی نے دولت کی منصفانہ تقسیم کو درہم برہم کر کے معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان رسہ کشی کو شروع کیا ہے، جس سے صرف نفرت پھیلی ہے اور اشتراکیت، اشتمالیت وغیرہ نظریات نے جنم لیا ہے۔[17]

یہ عجیب معاملہ ہے کہ ان کمزوریوں اور بنیادی خامیوں کے باوجود تمام عالم مغربیت زدہ ہوتا گیا۔ ہر ایک شعبۂ حیات میں مغربی اصولوں کو قابل تقلید سمجھا گیا اور ہر ایک شعبہ حیات کی بنیاد مغربی اصولوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ یہ معاملہ قانون قدرت کے بالکل خلاف نظر آتا ہے کہ اتنی کمزوریوں کے باوجود مغربی تہذیب "ترقی" کے ساتھ ساتھ "قائم" بھی ہے۔ اس سوال کا جواب ہمیں ان حالات کو پرکھنے سے حاصل ہوتا ہے جو حالات مغربی تہذیب نے اپنے لئے تیار کئے ہیں اور جو مغربی تہذیب کے بغیر باقی تمام تہذیبوں کو کمزور کئے ہوئے ہیں اور ان کو دوبارہ کھڑا ہونے اور اعتماد حاصل کرنے کا موقعہ نہیں دے رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کی توسیع اولاً ثقافتی تقلید سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تقلید ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ تمام اقوام میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ جب وہ مغلوب و محکوم ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے اوپر غالب آنے والی قوم کے ظاہر اطوار، نمائشی ملبوسات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی نقل کرنا شروع کرتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے بھی اس کمزوری کو بیان کیا ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ مفتوح قوم نہ صرف جسمانی غلامی قبول کرتی ہے بلکہ اس کے ذہن بھی غلام ہو جاتے ہیں کیونکہ مفتوح کی نگاہ میں فاتح کی عظمت سما جاتی ہے یا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فاتح میں کوئی غضب کمال ہے جس کی وجہ سے وہ حکومت کا مالک بن بیٹھا ہے اور یہ طبعی غلبہ کا تقاضہ نہیں، پھر جب یہ بات اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے تو وہ اس کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اس کی ہر ادا کو دل سے چاہنے لگتا ہے

اور اس کی ہر بات کا بصد شوق گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کی مشابہت اختیار کرنے لگتا ہے۔[18] ابن خلدون اس فعل کو اقتدار کہتے ہیں اور اس کو مفتوح قوم کی غلطی کہہ کر اسکے اس ظن کو واضح کرتے ہیں کہ مفتوح قوم فاتح کی قوت وغیرہ کو صرفِ نظر کر کے محض اس کی عادتوں اور خصلتوں کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اپنی عادتیں بھی اس کی سی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے مفتوح فاتح کی کھانے پینے میں، پہننے اوڑھنے میں، رہنے سہنے میں سواریاں رکھنے میں غرض ہر ادا میں اس کی مشابہت قبول کر لیتا ہے۔[19] علامہ ابن تیمیہ نے اس طرح کی مشابہت کے خلاف ایک مکمل کتاب ''اقتضاع الصراط المستقیم'' تحریر فرمائی ہے۔ اور اس میں ثابت کیا ہے کہ ایسی مشابہت سے معاشرت اور انسانوں کے ایمان میں خلل اور فتور آجاتا ہے۔[20]

اگر تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مغربی تہذیب نے اپنی ترقی کو جاری رکھنے اور حصول مادہ کے لئے استبداد اور ثقافتی تسلط جیسے آلات کا استعمال کیا ہے۔ ان آلات کا بھرپور استعمال یورپی سامراجیت (Imperialism) میں کھلم کھلا اور موجودہ دور میں مختلف نظریات کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت واضح ہے کہ مغربی تہذیب کے بیج مشرقی دنیا میں اس وقت بوئے گئے جب مغرب نے مشرق میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ یہ نوآبادیاں کہیں زور و طاقت کی بنیاد پر قائم کی گئی تو کہیں مکر و فریب کو آلہ بنا کر مغرب نے مشرقی تہذیب میں نقب لگانے کی کوشش کی۔

> ''مشرق و مغرب کا باہمی تعارف بہت قریب سے اس وقت ہوا جبکہ انیسویں صدی میں مغرب نے سیاسی یا اقتصادی مفاد کی خاطر اپنا آہنی اور مضبوط ہاتھ مشرق کی طرف بڑھایا اور اپنا ہاتھ یکے بعد دیگرے مشرق کے ممالک پر مسلط کیا اور اس کے ساتھ اپنے تمدن، صنعت، سائنس اور کلچر کے ساتھ یلغار کی، اور اپنے طرزِ حکمرانی کے اچھے اور برے پہلوؤں میں اس مشرق کو دبوچ لیا جو تمدن اور جنگی صنعت میں بہت پیچھے تھا، مشرق کو حملہ کی دہشت نے بہت دنوں تک تو اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ مشرق [مغرب] کو ذرا گہرائی کے ساتھ

دیکھ سکتا اور اس کے اصول اور جوہر و کمالات سے فائدہ اٹھا سکتا۔"[۲۱]

یہ وہ موقع تھا جب دو تہذیبوں کے درمیان قدرتی طریقہ پر کوئی لین دین نہیں ہوا بلکہ ایک طاقتور تہذیب نے ایک کمزور تہذیب پر بڑی دہشت کے ساتھ حملہ کیا اور اس محکوم تہذیب کو مزید ذلیل کرنے کی پیہم کوششیں کیں۔ ایک اور بات جو اس لین دین میں مانع ہوئی وہ یورپین حکام کا طرزِ عمل تھا جس میں ان کے احساس برتری، غرورِ حکمرانی اور اپنے آپ کو پیدائشی طور پر اس قوم کے مقابلہ میں برتر سمجھ کر اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا دخل تھا۔ عجیب معاملہ ہے کہ جس کے ہاتھوں سے انہوں نے زمام حکومت چھینی تھی اور جو کل تک دنیا اور ملک کی سیادت کر رہے تھے، جس کے احساسات زخمی اور جس کے جذبات نازک تھے۔ یہ سلوک احترام و انسانیت کے نظریہ کے بالکل خلاف تھا۔[۲۲] جہاں دہشت نے مشرق کو غالب قوم سے فائدہ اٹھانے سے دور رکھا وہیں مغربی تہذیب میں موجود عدمِ خدا خوفی اور مذہبی عنصر کی مغلوبیت نے بھی مشرق کو مغرب سے متنفر کر دیا۔ اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے بھی بڑی سختی سے مشرقی اقوام کو اپنے ماتحت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اس کے مقابلے میں جب اسلام نے غیر اسلامی علاقہ جات اور اقوام کو فتح کرنا شروع کیا تو مفتوح اقوام کے جذبات و احساسات کا بالکل خیال رکھا گیا اور اس عنصر کی طرف زیادہ توجہ دی گئی کہ برداشت (Toleration) کے اصول کو مفقود نہ ہونے دیا جائے۔[۲۳] اسلامی حکومت غیر مسلموں اور اہلِ کتاب سے ٹیکس (Tax) لینے کے بعد ان کی حفاظت اپنے ذمہ لیتی ہے۔ پہلے یہ قانون یہودی، عیسائی اور صابی اقوام کے لئے خاص تھا مگر بعد میں اس میں مجوسی اور مشرک ہندو بھی شامل کئے گئے اور یہی اسلام کی رواداری اور برداشت کو ظاہر کرتا ہے۔[۲۴]

اس ظلم و استبداد کے ساتھ مغرب کے ذی علم اشخاص نے ایک منظم طرز پر اسلام اور مسلم تہذیب کو مشکوک بنانے اور اپنے سیاسی اور مذہبی اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کے

لئے تصنیف وتحریر کا میدان اختیار کیا۔ اگر چہ انہوں نے اس میدان میں کچھ ایسے کارنامے بھی انجام دئے جس کی افادیت سے انکار کرنا انصاف کے برعکس ہوگا مگر انہوں نے بڑی عیاری اور مکاری سے علمی نکات پر اپنی ذہنی اپج کی کلائی چڑھائی کہ اسلامی ملت انتشار کی شکار ہونے لگی اور مسلم ممالک کا دانشور اور حکمران طبقہ اپنے لئے صرف مغربی تہذیب اور مغربی جدیدیت کو ہی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔[۲۵] اس علمی خیانت اور علمی سازش نے نہ صرف عام فہم مسلمان کو مغرب سے مرعوب کیا بلکہ عالم اسلام کے کئی جید علماء و مصلح مفکر بھی اس جانسے کے شکار ہوئے اور انہوں نے تجدید امت کے بجائے تجدد سے کام لیکر مشرق پر مغربی تہذیب کو زبردستی نازل کرنے کی کوشش کی۔ اس سازش کی وجہ سے جدید مسلمان اپنے عقائد اور اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرنے لگے اور ان کا اعتماد ڈگمگانے لگا۔[۲۶]

Edward W. Said استشراقیت (Orientalism) کو مصنفین اور وسیع سیاسی اغراض جن کو برطانوی، فرانسیسی اور امریکی سلطنتیں ترتیب دیتے ہیں، کے درمیان ایک متحرک لین دین (Dynamic Exchange) تصور کرتے ہیں۔[۲۷] اسی قلم کا استعمال کر کے اسلامی اتحاد کو توڑا گیا اور عرب وعجم کے درمیان گہری کھائی کھودی گئی۔ عربی زبان کو فروغ دینے کی آڑ میں عربیت اور عرب قوم پرستی کو ہوا دی گئی اور اسلامی عنصر اور تشخص کو دبانے کی کوشش کی گئی۔[۲۸] ترک اور عرب دو قومیں نظر آنے لگی اور دونوں میں سیاسی اغراض کے لئے فرانسیسی اور برطانوی مستشرقین نے مغربی تخم ریزی شروع کر دی۔ مصر مصریوں کا ہے اور اس کے مستقبل کو فرعون کے ماضی سے جوڑنے کی منظم کوشش کی گئی جبکہ ترک ترکوں کا ہے اور اس کے مستقبل کو یورپ کی آغوش میں دیا گیا۔

مغربی تہذیب کو وسیع تر بنانے کے لئے مغرب نے دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ اس مقصد کے لئے مغرب نے سامراجیت کا تانڈو ناچ جاری رکھتے ہوئے کئی مسلم علاقوں پر اپنی اجارہ داری قائم کی۔ ان کے قدرتی وسائل اور دولت کو دو دو

ہاتھوں سے لوٹا گیا۔ ان کی آباد اور ترقی یافتہ ثقافتوں کو کچل دیا گیا۔ اس نوآبادیت اور سامراجیت کی خدمت جہاں قلم و کتاب نے بھی انجام دی وہی عیسائی مشینریوں نے بھی اس سامراجیت کے سائے میں اپنی تنظیموں کا وسیع جال بچھادیا۔

سامراجیت (Imperialism) اور نوآبادیت (Colonialism) ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔ سامراجیت کے معنیٰ غالب اور بڑے مرکز کی وہ حکمتِ عملی، نظریہ اور رویہ ہے جس سے وہ دور دور علاقوں پر اپنی حکومت چلاتا ہو۔ نوآبادیت اکثر سامراجیت کا نتیجہ ہے جس میں دور دراز علاقہ جات میں اس غالب اور عظیم مرکزی ملک کی طرف سے نوآبادیاں قائم کی جاتی ہے۔[29] اس میں ایک سلطنت رسمی یا غیر رسمی رشتہ سے دوسرے سیاسی معاشرہ کی سیاسی خودمختاری پر تسلط قائم کرتا ہے۔ یہ تسلط طاقت، سیاسی اشتراک یا اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی ماتحتی کے بل پر حاصل کیا جاتا ہے۔[30]

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نوآبادیت اور سامراجیت کا دور اس وقت شروع ہوا جب موجودہ مغربی تہذیب کے بنیادی عناصر، یونان اور روم، نے افریقہ اور یورپ میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ لیکن نوآبادیت اور سامراجیت کی جدید اور زیادہ خطرناک صورت اس وقت رونما ہوئی جب ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ اور Vasco de Gama نے ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کو دریافت کیا۔ تجارتی مقاصد اور مفادات کے لئے پرتگال اور اسپین نے اپنی نوآبادیاں امریکہ اور ایشیاء میں قائم کیں۔ یہ کام اگرچہ بظاہر تجارتی مفادات پر ہماری توجہ مرکوز کرتا ہے مگر ہمیں اس حقیقت کو بھی اذہان سے خارج نہیں کرنا چاہیے کہ اس ظلم و تشدد کے پیچھے موجودہ مغربی تہذیب کا تیسرا بنیادی عنصر -عیسائیت- بھی کارفرما تھا۔

۱۵۰۶ء میں پوپ جولیس دوم (۱۵۰۳ء-۱۵۱۳ء) نے ایک پاپائی حکم کے ذریعے دنیا کو دو طاقتوں میں تقسیم کیا۔ جن میں ایک طاقت مشرق پر قابض تھی اور پرتگال کے نام سے جانی جاتی تھی جبکہ دوسری طاقت مغرب پر تسلط جمائے ہوئے تھی اور اسپین کے نام

سے وجود میں آچکی تھی۔ پروٹسٹنٹ کلیساء سے تعلق رکھنے والے ممالک مثلاً انگلستان، ہولینڈ وغیرہ نے اس پاپائی حکم کو رد کیا اور اسپین اور پرتگال کے حقِ تسلط کو للکارنے لگے۔ آخر ۱۵۸۸ء میں اسپین تباہ کیا گیا اور انگلستان نے دونوں ممالک - ہندوستان اور امریکہ - پر تسلط جمایا۔ ۱۶۰۰ء میں ہندوستان میں East India Company کا قیام عمل میں لایا گیا اور انہی دنوں امریکہ میں بھی مختلف برطانوی نوآبادیاں قائم کی گئیں۔

۱۶۶۴ء میں فرانس نے بھی دوسرے غریب ممالک پر اپنا تسلط جمانا شروع کیا اور ہندوستان اور امریکہ میں اپنی کچھ نوآبادیاں معرضِ وجود میں لائیں۔ یہ نوآبادیاں محض کاروباری وجہ سے ان نوآبادکاروں کے درمیان جنگ وجدل کا سبب بنی۔ کئی جنگیں ہوئیں اور کئی غریب ممالک ان نوآبادکاروں کے مفادات اور اغراض کی نذر ہوتے گئے۔

نوآبادیت کا تیسرا دور انیسویں صدی سے شروع ہوا اور دوسری جنگِ عظیم کے اختتام تک ظاہری طور پر جاری رہا۔ اس تیسرے دور میں جرمنی، بلجیم، اٹلی، جاپان اور امریکہ نے بھی بحیثیت نوآبادکار کے اپنے آپ کو دنیا میں ظاہر کیا۔ نوآبادیت کے تیسرے دور میں دنیا کافی حد تک بدل گئی تھی اس لئے اس دور میں دوسرے قدیم مقاصد کے علاوہ کچھ نئے اغراض بھی نوآبادیت کے محرکات رہے جن میں یورپ میں صنعتی انقلاب قابل ذکر ہے۔

یورپ کی صنعتوں میں تیار عمدہ اور سستا مال ان مقبوضہ بازاروں میں اتارا گیا جس سے یہ غریب ممالک اور بھی غریب ہوتے گئے۔ ان کے دستکار و کاریگر بالکل بیکار ہوگئے۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کی سامراجیت میں عیسائی مبلغین کا پلہ زیادہ بھاری تھا۔ وہ کھلم کھلا دیگر مذاہب سے وابستہ افراد کو اپنے مذہب کی طرف بلاتے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں Manning جو کہ East India Company سے وابستہ تھا، نے اعلاناً قبول کیا کہ ان کا ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کا مقصد محض عیسائیت کو پھیلانا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی ممالک کو بظاہر آزاد کیا گیا اور ان کو مختلف تنظیموں کا ممبر بھی بنایا گیا مگر اصل میں ان کو مزید محتاج بنایا گیا اور ان کی خودمختاری جدید غلامی کی خوبصورت نوعیت تھی۔

نوآبادکاروں نے ان نئے ممالک کو اصل میں اقتصادی اور ذہنی طور پر غلام رکھا تھا۔ نئے ''آزاد'' مسلم ممالک اقتصادی طور پر غریب، ٹیکنالوجی میں پیچھے، معاشرتی لحاظ سے غیر منظم تھے۔[31] اور پھر ان ممالک کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے یہی نوآبادکاران کو امداد دیتے ہیں جس سے ان کی غلامی میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ایسے ممالک قرض میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں براہِ راست نوآبادیاں قائم نہیں ہے بلکہ سامراجیت بدستور ثقافتی، سیاسی، نظریاتی، اقتصادی اور معاشرتی میدانوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔[32]

پہلی جنگ عظیم میں عظیم مسلم سلطنت کی بندر بانٹ کردی گئی۔ اس کو الگ الگ محکوم ملکوں میں تقسیم کیا گیا اور مغربی ممالک ان پر اپنی بالادستی کو اس قدر مضبوط کرتے گئے کہ آئندہ بظاہر ''آزاد'' ہونے کے بعد بھی وہ مغربی تسلط اور اثر سے آزاد نہ ہوسکے۔ اس بندر بانٹ کا ثبوت Sykes-Picot Agreement میں صاف نظر آتا ہے۔ یہ معاہدہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ۹ مئی ۱۹۱۶ء کو خفیہ طور پر برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے Sir Mark Sykes اور فرانس کی طرف سے Francois Georges Picot نے اس معاہدہ میں حصہ لیا۔ اس معاہدہ میں ایک اور استعماری طاقت۔ روس۔ کی منظوری بھی شامل تھی۔ اس معاہدہ کا مقصد پہلے عثمانی سلطنت کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنا تھا پھر ان ٹکڑوں کو مختلف استعماری طاقتوں کے درمیان بانٹنا تھا۔ اس معاہدہ کے مطابق مختلف استعماری طاقتیں درج ذیل علاقوں پر قبضہ کریں گی:

شمار	استعماری طاقت	علاقہ جات
۱۔	روس	آرمینیا، Bitlis,Van, Trebizond جس کے ساتھ کُرد کا کچھ جنوب مغربی حصہ بھی ہے۔
۲۔	فرانس	لبنان، شام کے کچھ ساحلی علاقہ جات، ادانہ Cilicia وہ اندرونی علاقہ جات جو روس کے حصہ کے ساتھ پڑتے ہوں۔

		Aintab، عرفہ، ماردن، دیارِ بکر اور موسول۔
۳۔	برطانیہ	جنوبی میزوپوتامیہ بشمول بغداد و بصرہ اور حیفہ و اکہ کی بندرگاہیں، اس کے علاوہ بحر فارس، عرب، حجاز، وادیٔ اردن، قصر وغیرہ بھی برطانیہ کے حصہ میں آئیں گے۔
۴۔		برطانیہ اور فرانس کے قبضہ میں آنے والے علاقوں کے درمیان ایک آزاد عرب ریاست یا کئی عرب ریاستوں کی متحدہ ریاست ہوگی جو برطانیہ اور فرانس کے زیر اثر منقسم رہیں گی۔
۵۔		اسکندریہ ایک آزاد بندرگاہ ہوگی۔
۶۔		چونکہ فلسطین میں مقدس مقامات ہیں، اس لئے یہ بین الاقوامی نظم و نسق کے تحت رہے گا۔

یہیں سے پہلے لیگ آف نیشنز اور بعد میں اقوام متحدہ کی تنظیم کے وجود کو راہ میسر ہوئی [۳۳]۔ فلسطین کی سرزمین میں اسرائیل کی آبادکاری بھی اسی معاہدہ کا نتیجہ ہے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی مسلم ممالک کو الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹا گیا اور مسلمانوں کی یک جہتی کی عمارت منہدم کی گئی۔ یہاں تک کہ شریفِ مکہ حسین ابن علی نے بھی ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور الگ عربی ریاست حاصل کرنے کے لالچ میں برطانیہ کا ساتھ دیا۔ اور نتیجتاً مسلم قوم جو ایک وقت دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی آج تک محکوم و غلام بنی ہوئی ہے۔

﴿انا للہ و انا الیہ راجعون﴾

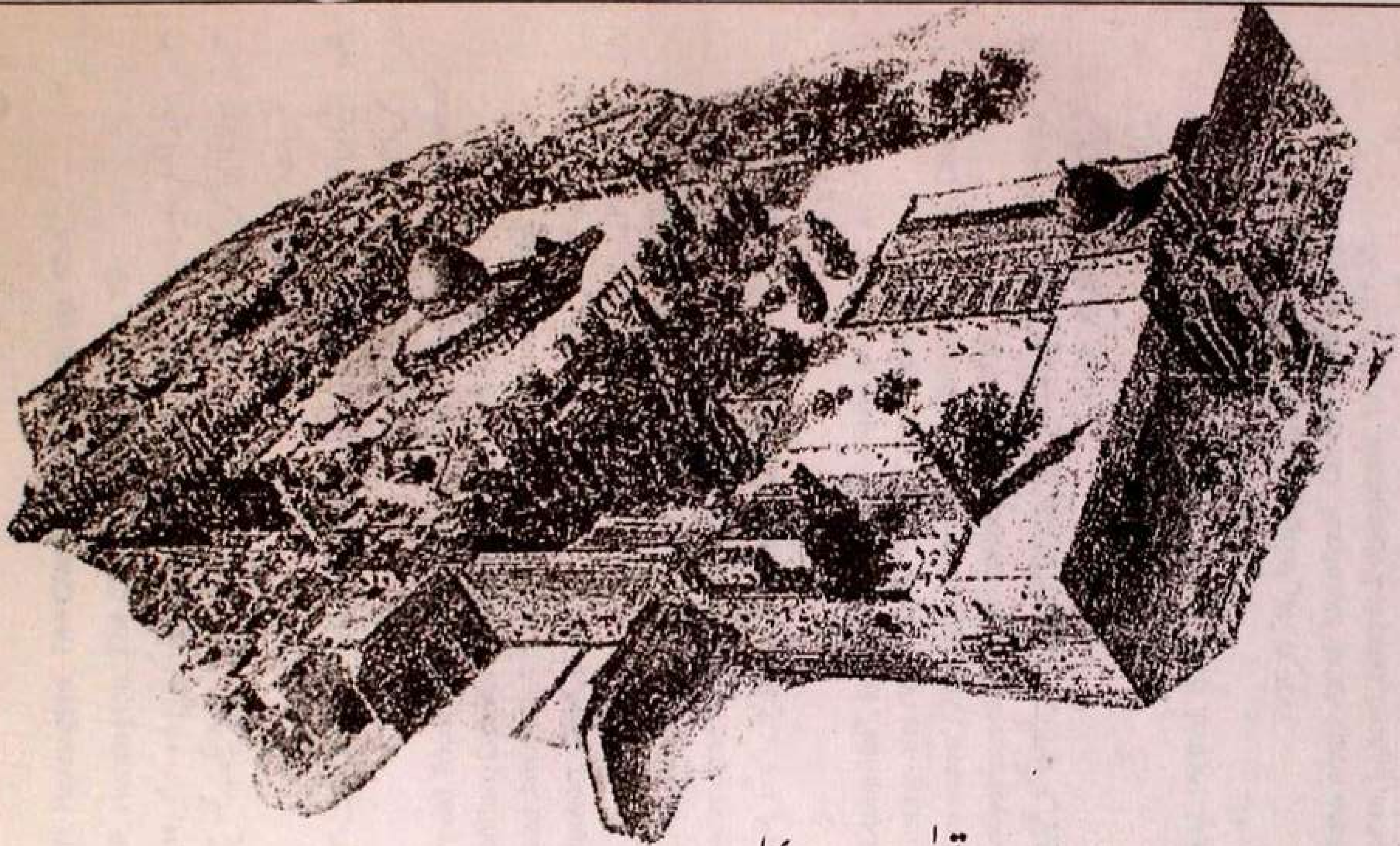

مسجدِ اقصٰی - اسرائیلی (یہودی) نرغے میں

[مقابل صفحہ نمبر ۴۴]

حواشی

1. S.P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, pp. 45-47.
2. S.P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, p. 69.

۳۔ معید الظفر، عیسائیت اور تثلیث، کشمیر، علامہ ابن تیمیہ ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۲، ص ۱۹۔

۴۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، لکھنو، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۶۔

۵۔ ایڈون اے۔ برٹ، فلسفۂ مذہب، مترجم: بشیر احمد ڈار، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۴۰۔

6. *Arnold Toynbee- A Selection from his Works*, ed. E.W.F. Tomlin, London, Oxford University Press, 1978, p. 281.
7. Syed Amir Ali, *A Short History of Saracens*, N. Delhi, Kitab Bhawan, 1994, p. 247.

۸۔ ایضاً، ص ۳۲۲۔

9. "Crusades", *Encyclopaedia Britannica*, Vol.6, Chicago, Encyclopaedia Britannica Ltd., 1951, p. 776.

"[یروشلم] پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد وہاں ۷۰ ہزار مسلمانوں، یہودیوں، عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام کیا گیا۔"

("Crusades", *Encyclopaedia of Religion and Ethics*, ed. James Hasting, Vol.IV. N. York, T.&T. Clark, 1935, p. 347).

10. "Crusades", *The New Encyclopaedia Britannica*, Vol.5, Chicago, Encyclopaedia Britannica Inc. 1975, p. 300.

۱۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۹۵ء، ص ۵۴-۵۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۶۔

13. M.M. Picthal, *Cultural side of Islam*, N. Delhi, Kitab Bhavan, 1990, p. 41.

۱۴۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص ۲۳۴۔

15. Muhammad Akbar Muradpuri, *Conflict Between Socialism and Islam*, Lahore, Islamic Publications, 1970, P. 31-33.

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۳۷۹۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۷۹-۳۸۰۔

۲۰۔ علامہ ابن تیمیہ، اسلام اور غیر اسلامی تہذیب، مترجم: مولوی شمس تبریز خان، لکھنؤ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۹، ص ۹۹-۱۰۱۔

۲۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، لکھنؤ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۸۱، ص ۱۵۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵-۱۶۔

23. Ameer Ali, *The Spirit of Islam*, Delhi, Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, 1978, p. 213.

24. *Arnold Toynbee- A Selection from his Works*, ed. E.W.F. Tomlin, Lon., Oxford University Press, 1978, p. 119.

۲۵۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین، لکھنؤ، مجلس تحقیقات و نشریات، اسلام، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳-۱۴۔

26. Ilse Lichtenstadter, *Islam and Modrn Age*, Delhi, Muslim Academy, 1982, p. 195.

27. Edward W. Said, *Orientalism*, England, Penguin Books, 1995, pp. 14-15.

28. Bassam Tibi, *Arab Nationalism- A Critical Enquiry*, New York, St. Martin Press, 1991, pp. 100-101.

29. Edward W. Said, *Culture and Imperialism*, New York, Vintage Books, 1994, p.9.

۳۰۔ ایضاً

31. Ziauddin Sardar, *The Future of Muslim Civilization*, London, Mansell Publishing Limited, 1987, pp. 60-61.

32. Edward W. Said, *Culture and Imperialism*, New York, Vintage Books, 1994, p. 9.

33. "Sykes-Picot Agreement", *The Oxford Dictionary of 20th Century History–1914-1990*, Peter Teed, New York, Oxford University Press, 1992, pp. 452-453.
"Sykes-Picot Agreement, "*The New Encyclopaedia Britannica*, Vol II, Chicago, 1992, p. 454.

باب سوم

مغربی تہذیب اور موجودہ سیاسی صورتِ حال*

جمعرات، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد پوری دنیا کے سیاسی حالات یکا یک بدل گئے۔ مغربی حکومتیں اعلانیہ مشرق کے خلاف جارحانہ انداز اختیار کرنے لگی جبکہ مشرقی ممالک بالعموم اور اسلامی ممالک بالخصوص مسلم تحریکات اور مسلم ملت کے مفادات سے دستبردار ہونے لگے۔ مغربی تہذیب میں موجود یونانی، رومی اور عیسائی عناصر کے خصائل نمایاں نظر آنے لگے۔ مادیت کے حصول کے لئے انسانی اقدار کی پروا کئے بغیر مشرقی ممالک کو اپنا غلام بنانا شروع کیا گیا۔ مغربی سامراجیت اور مغربی نوآبادیاں نئے لباس میں اور نئے ناموں کے تحت پھر سے ظاہر ہونے لگی۔ مسلم ممالک کے حکمران مسلم مفادات کے بجائے مغربی مفادات کے حق میں بولنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ امریکہ- جو کہ مغربی تہذیب کی قیادت کر رہا ہے اور اس کی Core State بنا ہوا ہے- نے کھلم کھلا کئی مسلم ممالک کی ظاہری خود مختاری پر حملہ کر کے ان کو اپنا غلام بنا دیا۔ امریکی غرور اور امریکی انا مسلم اقوام کیلئے برہنہ تلوار ثابت ہو رہی ہے اور مسلم ممالک سخت نکبت کی حالت میں یہ جارحانہ اقدامات اور نو صلیبی جنگیں برداشت کر رہے ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری اور بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں دولتِ عثمانیہ سے دور یورپ میں ایک الگ یہودی ملک کے قیام کے لئے تگ و دو شروع ہونے لگی۔ اس جدوجہد میں وہ یہودی شامل نہیں تھے جو مملکت عثمانیہ میں آباد تھے، بلکہ یہ

---

* اس مضمون میں دی گئی اکثر تاریخیں Dilip Hiro (Dates) کی کتاب *War without End* سے لی گئی ہیں۔

تحریک یورپ میں زور پکڑ رہی تھی اور فلسطین کی مقدس زمین پر الگ یہودی ریاست آباد کرنے کی مانگ کر رہی تھی۔ اس تحریک کو تاریخ میں صیہونیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عالمی صیہونی تنظیم (World Zionist Organisation) کے بانی اور پہلے صدر Theodor Herzl (۱۸۶۰ء-۱۹۰۴ء) نے پہلی صیہونی کانگریس- جو اگست ۱۸۹۷ء میں Basel کے مقام پر منعقد ہوئی- میں اسرائیل کے قیام کو عمل میں لانے کے لئے اس مجلس کو منعقد کر کے اسرائیل کی سنگ بنیاد ڈالی۔ ۱۸۹۶ء میں اس نے The Jewish State کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا جس نے پوری دنیا میں منتشر یہودیوں میں کافی شہرت حاصل کی۔ اگرچہ تاریخ میں Herzl پہلا شخص نہیں ہے جس نے الگ یہودی ریاست کا مطالبہ کیا ہو۔ اس سے پہلے نپولین نے بھی ۱۷۹۹ء میں اس کے متعلق سوچا تھا، اسی طرح Moses Hess جو کہ کارل مارکس کا دوست تھا، نے بھی ۱۸۶۲ء میں Rom and Jerusalem کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں الگ یہودی ملک کے نظریہ کو پیش کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے اس نظریہ کو برطانیہ نے شہ دی اور اس کے مطالبہ کو ہوا دینے لگا۔ اس کے بعد امریکہ نے بھی ان کے مطالبہ کی حمایت کی اور آخر میں اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء میں فلسطین کی تقسیم کے حق میں رائے دی اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔ تب سے لیکر آج تک اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان کئی جنگیں لڑی گئی اور ۹ جون ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل کی چھ دنوں کی جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی عرب ممالک اسرائیل کے سامنے پوری طرح کمزور اور بے بس نظر آنے لگے۔ اور ایک یہودی مذہبی رہنما کے مطابق دو ہزار سال کے بعد یہودیوں کو مسلمانوں کے قبلہ اولیٰ یعنی بیت المقدس میں داخلہ کا موقع ملا۔[1]

اسرائیل کا قیام تاریخ میں ایک عجیب معمہ ہے۔ یہودیوں کو پوری دنیا سے لاکر فلسطین میں جمع کیا گیا اور فلسطین میں بنیادی طور پر آباد مسلمانوں کو بے دخل کر کے ان کو

اپنے ہی ملک میں غلام بنایا گیا۔ Dr. Nahum Goldmann جو کہ صیہونی ریاست کے اولین معماروں میں شمار ہوتا ہے، نے فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کے قیام کی وجہ کو یوں بیان کیا ہے:

> ''یہودی Uganda, Madagascar یا کسی اور جگہ پر یہودی وطن قائم کر سکتے تھے مگر وہ مکمل طور پر فلسطین کے بغیر اور کچھ نہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ بحر مردار کے پانی سے تبخیر کے بعد پانچ ٹریلین ڈالر کی دھات جیسی Metalloid اور دھات کا چورا حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے نہیں کہ فلسطین کی زمین میں دو امریکوں کے مکمل ذخائر سے بیس گنا زیادہ پٹرول موجود ہے۔ بلکہ اس لئے کہ فلسطین عالمی سیاست طاقت کا اصل مرکز اور جنگی نوعیت سے دنیا پر تسلط جمانے کے لئے موافق علاقہ ہے۔''[۲]

اس اقتباس سے صیہونی اغراض و مقاصد واضح ہوتے ہیں، اگر چہ وہ پہلی وجوہات کا انکار کرتے ہیں مگر ان وجوہات کا ذکر کرنا ہی ان دو وسائل پر ان کی نظر ہونے کی دلیل ہے۔ مغربی طاقتوں نے ہی مغربی ایشیا (مشرقِ وسطیٰ) میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا ہے اور اسرائیل انہیں مغربی ممالک کی امداد اور حمایت سے آج تک دنیا میں موجود ہے۔ مگر اسرائیل نے بتدریج مغربی ممالک کے چند بنیادی ادارہ جات پر قبضہ کر کے بڑے مغربی ممالک کو اپنے اثر میں بنائے رکھا ہے۔ ان ادارہ جات میں مغربی ممالک کی اقتصادیات، میڈیا، خارجی پالیسی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مسئلۂ فلسطین ایک ایسی بنیادی وجہ ہے جس سے پوری دنیا میں مسلمانوں نے مغربی طاقتوں بشمول اسرائیل کے استحصال اور غاصبانہ رویہ کے خلاف ''بین الاقوامی انتفاضہ'' برپا کیا ہے۔ جس کی جڑیں تہذیبی تصادم میں نہیں بلکہ تہذیبی تسلط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

اسرائیل کے وجود میں جس قدر مغرب کا ہاتھ رہا ہے اسی قدر اس مسئلہ میں مسلم ممالک اور بالخصوص عرب ممالک ذمہ دار نظر آتے ہیں۔ ۱۹۱۶ء-۱۹۱۸ء کی عرب بغاوت میں اہلِ عرب نے برطانیہ کی ایما پر دولت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی علم اٹھائی۔ جس سے عرب ترک قیادت سے جدا ہو کر مغرب کی سازشوں کے لئے عریاں ہوا۔ چھوٹے چھوٹے

ذاتی مفادات کو ملی مفادات پر ترجیح دی گئی۔ عرب لیگ ان ذاتی مفادات کے چلتے ناکام ثابت ہوئی۔ عرب قومیت اس قدر عربوں پر سوار ہوئی کہ انہوں نے اپنی جڑیں اکھاڑنا ہی اپنی ترقی سمجھ لیا۔ بیجا تعریفوں کے پل باندھے گئے، جذباتی تقاریر سے لوگوں کو دھوکے میں رکھا گیا اور اپنی فوجی طاقت بڑھانے اور دیگر ضروری امور میں ترقی کرنے سے گریز کیا گیا۔ ملت اسلامیہ دو گروہوں میں بٹ گئی، ایک گروہ مسئلہ فلسطین کو محض جمہوری اور سیکولر مسئلہ سمجھنے لگا جبکہ دوسرا گروہ اس کی دینی اہمیت اور مرکزیت کو پیش کرتا تھا۔ غرض اس نازک دور میں بھی مسلم متحد نہ ہو سکے اور صیہونیت اسلامی سرزمین میں اپنا الگ وطن تراشنے میں کامیاب ہوئی۔

ابھی ترکی میں عثمانیہ خلافت قائم ہی تھی کہ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب رونما ہوا۔ روس کی ۳۰۰ سالہ رومینو (Romanov) حکومت ختم ہوئی۔ زار (Czar) حکومت سے دستبردار ہوا۔ ۱۹۱۸ء کے جولائی مہینہ میں سوویت قانون کا باضابطہ سرکاری سطح پر اعلان کیا گیا۔ لینن (Lenin) نے سرکار کو پتروگارڈ (Petrograd) سے ماسکو (Moscow) منتقل کیا۔ آخر کار ۱۹۲۲ء میں سوویت یونین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سوویت یونین کا بانی لینن (۱۸۷۰ء-۱۹۲۴ء) تھا۔ اور سوویت یونین کا نظام کمیونزم پر مبنی تھا۔ اس سے پہلے ۱۸۳۹ء-۱۸۴۲ء اور ۱۸۷۸ء-۱۸۸۰ء میں روس نے افغانستان کی سرزمین اور برطانیہ نے ہندوستان کی سرزمین سے دو جنگیں لڑی تھیں۔ چونکہ افغانستان اس وقت دو بڑے مشرقی اور مغربی ملک کے درمیان پڑتا تھا اس لئے اس کو ہر طرف سے نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ بالکل پسماندہ رہا، تعلیم و تربیت اور صحت و اقتصادیات میں جمود طاری رہا۔ غرض افغانستان ہر لحاظ سے مفلوک الحال ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں جب افغانستان کے حکمران امان اللہ (۱۹۱۹ء-۱۹۲۹ء) نے یورپ کا دورہ کیا اور واپسی پر ترکی اور ایران ہوتے ہوئے افغانستان پہنچا تو اس کا ذہن پوری طرح یورپی تہذیب کا دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے اعلانیہ افغانستان کو مغرب بنانا شروع کیا۔ چونکہ افغانستان اور سوویت یونین کا رشتہ ۱۹۲۱ء سے ہی بہترین اور دوستانہ رہا ہے، ۱۹۲۱ء میں امان اللہ دنیا کے پہلے حکمران تھے جس نے سوویت یونین کو قبول

کیااوراس کے ساتھ معاہدہ بھی کرڈالا۔۱۹۴۷ء میں پاکستان کاوجود میں آنا افغانستان کے ساتھ ایک طویل تنازعہ کا باعث بنا۔افغانستان پاکستان کے پشتون علاقوں کوافغانستان کا حصہ کہنے لگا اوران کو پاکستان سے آزاد کرکے الگ پشتونستان بنانے کے لئے تحریک شروع کردی۔پاکستان نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور۱۹۵۳ء میں مغرب کے قائد امریکہ کے ساتھ Mutual Security Pact کے نام سے معاہدہ کیا۔اس کے جواب میں کابل نے ماسکو کی راہ اختیار کی۔اس وقت محمد ظہیر شاہ (۱۹۳۳-۱۹۷۳ء) افغانستان کا بادشاہ تھا۔۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو ظہیر شاہ اٹلی میں علاج کے لئے گیا تھا کہ افغانستان میں محمد داؤد خان نے حکومت پر قبضہ کرکے اس کو تخت و ملک سے بالکل دور کردیا۔۱۹۷۷ء میں پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل محمد ضیاء الحق نے حکومت سے بے دخل کرکے اس کا تختہ اُلٹ دیا۔اور۱۹۷۹ء میں سوویت یونین پکتیہ میں ابھرتی ''بغاوت'' کو دبانے کے لئے افغانستان میں داخل ہوا اور دسمبر ۱۹۷۹ء میں دو سوویت بٹالین نے بگرام ہوائی اڈے پر کنٹرول حاصل کیا۔بادشاہ کے محل پر حملہ کیا گیا اور بابرک کارمل (Babrak Karmal) جو ماسکو میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا کو ملک کا حکمران بنادیا گیا۔سرد جنگ - جو ۱۹۴۶ء سے روس اور امریکہ کے درمیان جاری تھی - اب گرم ہونے لگی۔پاکستان، سعودی عرب اور امریکہ نے متحد ہوکر سوویت یونین کے خلاف مورچہ کھولا اور سموئیل کے الفاظ میں یہ جنگ نظریاتی (Ideological) بنیادوں پر لڑی گئیں۔

گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود، صبغۃ اللہ مجددی، عبدالرب رسول صیاف وغیرہ افغان جہاد کے بڑے قائد بنے۔۱۹۸۳ء میں افغان مجاہدین کی سات تنظیموں نے ایک اتحاد قائم کیا اور اس کو Islamic Alliance of Afghan Mujahideen (IAAM) کا نام دیا اور عبدالرب رسول صیاف کو اس کا چیرمین اور صبغۃ اللہ مجددی کو اس کا نائب چیرمین بنادیا۔چونکہ عبدالرب رسول صیاف مدینہ یونیورسٹی اور الازہر کا طالب علم رہ چکا تھا - اور فکری طور پر شیخ محمد بن عبدالوہاب سے متاثر تھا اس لئے وہ

عرب دنیا خصوصاً مصر میں کافی مشہور تھا۔ نے سعودی عرب کے رئیس اور سول انجینئر اسامہ بن لادن کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جو پہلے ہی یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۷۹ء میں مکہ مکرمہ میں ہوئے سعودی حکومت کے خلاف سعودی اخوان کی طرف سے کئے گئے احتجاج سے کافی متاثر ہوا تھا۔ سوویت یونین کے خلاف اسامہ بن لادن نے ایک منظّم حکمت عملی کا استعمال کیا۔ اس نے سعودی امداد، امریکی ہتھیار اور عرب نوجوانوں کو افغان جہاد میں شامل کرنے کے لئے سخت محنت کی اور خود پاک افغان سرحد پر مقیم ہو گیا۔

۱۵ فروری ۱۹۸۹ء کو سوویت افواج افغانستان چھوڑ کر چلی گئی اور ۱۹ فروری ۱۹۸۹ء کو راولپنڈی میں صبغۃ اللہ مجددی کو افغانستان کا چیرمین، عبدالرب رسول صیاف کو نائب چیرمین اور گلبدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی کو بالترتیب خارجہ وزیر اور داخلہ وزیر بنایا گیا جبکہ یونس خالص کو وزیر دفاع کا عہدہ دیا گیا، مگر صدر نجیب اللہ (۱۹۸۶-۹۲ء)- جو کہ کمیونسٹ نظریہ سے تعلق رکھتا تھا- کی حکومت بدستور کابل پر جاری رہی۔ حکمت یار کی حزبِ اسلامی اور احمد شاہ مسعود کی جماعت اسلامی میں جنگ چھڑ گئی۔ غیر افغان مجاہدین کے سربراہ اسامہ بن لادن نے دونوں کو سمجھانے کی بے حد کوشش کی مگر دونوں نہ مانے۔ اسی دوران ۱۹۸۹ء کے نومبر مہینہ کی ۲۴ تاریخ کو اسامہ کا قریبی ساتھی ڈاکٹر عبداللہ عزام*

---

* ڈاکٹر عبداللہ عزام فلسطین میں پیدا اور مشرقی اُردن میں مقیم ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اُردن میں حاصل کرنے کے بعد اُردن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ساٹھ کے عشرے میں فلسطین کے جہاد میں حصہ لیا مگر وہاں اسلامی جذبے کے بجائے قومیت اور تجدد کی پرستش سے مایوس ہو گئے اور دعوت کا راستہ اختیار کیا۔ آخر کار اُردن چھوڑ کر مکہ مکرمہ کی اُم القریٰ یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں جب اسلام آباد پاکستان میں عالمی اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تو ڈاکٹر موصوف کو وہاں بحیثیت لیکچرار تعینات کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں جب سوویں یونین کے خلاف جہاد کا اعلان ہوا تو موصوف اس میں شامل ہوئے۔ موصوف نے کئی کتابیں عربی میں تحریر کی ہیں جن میں کچھ کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً میدان پکارتے ہیں، دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے، وغیرہ۔ ڈاکٹر موصوف نے افغان جہاد کے دوران بحیثیت میڈیا، افغان جنگ کی خبریں پوری دنیا میں پھیلا دی اور عرب ممالک سے بڑی بڑی رقوم افغان جہاد کے لئے حاصل کی۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں افغانی تہذیب پر بہت ہی ناقدانہ انداز سے گفتگو کی ہے۔

ایک بم دھماکہ میں جاں بحق ہوا اور اسامہ نے ان کے ''مکتب الخدمات'' کو نیا نام۔ ''القاعدہ''۔دے کر جاری رکھنے کا ارادہ کیا۔

۱۹۸۹ء میں جب برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار گرادی گئی تو سوویت یونین کے ٹوٹنے کے آثار نظر آنے لگے جو ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء میں حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ سوویت یونین باقاعدہ ٹوٹ گیا اور اسی کے ساتھ وہ سرد جنگ بھی اختتام کو پہنچی جو جنگ دوسری جنگ عظیم کے بعد سیاسی، اقتصادی اور فوجی میدانوں میں امریکہ اور اس کے مغربی یورپی اتحادی اور سوویت یونین اور دوسری کمیونسٹ ریاستوں کے درمیان برپا تھی۔

روس کے افغانستان کے چلے جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۲، اگست ۱۹۹۰ء میں عراق نے اچانک کویت پر فوج کشی کی۔ چند گھنٹوں میں عراق کی افواج نے کویت کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ جس سے پوری دنیا میں عراق کے خلاف لہر برپا ہوئی۔ مغربی ممالک کویت کی حمایت میں کھڑے ہوئے۔ اقوام متحدہ نے اس حملہ کی مذمت کی۔ امریکہ کے صدر جارج بش (سینئر) نے عراق پر فوج کشی کا من بنالیا اور اس امر سے پریشان تھا کہ عراق پر حملہ کرنے کے لئے موافق Bases صرف سعودی عرب ہی فراہم کرسکتا تھا۔ ان Bases کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ نے ایک چال چلی جس کے تحت اس نے سعودی عرب کے شاہ فہد کو سعودی عرب پر عراقی حملہ کی غلط اور جھوٹی اطلاع دی اور سعودی عرب کو مجبور ہوکر امریکی افواج کو Bases فراہم کرنے پڑے۔ اس وقت عراق کا صدر صدام حسین تھا۔

صدام حسین (پیدائش ۱۹۳۷ء) ۱۹۵۷ء میں بعث سوشلسٹ پارٹی (حزب البعث العربی الاشتراکی) میں شامل ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں اس نے عراق کے وزیراعظم عبدالکریم قاسم (متوفی ۹ فروری ۱۹۶۳ء) پر ہوئے قاتلانہ حملہ میں شرکت کی اور زخمی حالت میں پہلے شام اور پھر مصر چلا گیا۔ جب ۱۹۶۳ء میں عراق میں بعثی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تو وہ گرفتار ہوا اور جیل سے کئی سال بعد فرار ہوکر بعث پارٹی کا قائد بنا اور ۱۹۶۸ء میں حکومت حاصل ہونے کے بعد وہ ۱۶ جولائی ۱۹۷۹ء میں عراق کا صدر بن گیا۔ وہ عرب دنیا میں مصر کا

مقام حاصل کر کے اس کی قیادت کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں انقلاب برپا ہوا اور ستمبر ۱۹۸۰ء میں صدام حسین نے ایران پر حملہ بول دیا۔ یہ جنگ مسلسل آٹھ سال تک جاری رہی اور ۱۹۸۸ء میں جنگ بندی پر ختم ہوئی۔ چونکہ اس جنگ سے عراق کی معاشی حالت تباہ ہو چکی تھی اور عراق پر دیگر ملکوں کے قرضہ جات باقی تھے تو اپنے ملک کو کویتی تیل سے خوشحال بنانے کی غرض سے عراق نے اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر حملہ بول دیا۔ عراق ایران جنگ میں سعودی عرب براہِ راست اور امریکہ اور سوویت یونین پس پردہ عراق کی حمایت اور امداد کرتے رہے۔

امریکہ نے سعودی عرب میں اپنی Bases قائم کرنے کے لئے شاہ فہد پر دباؤ ڈالا۔ مگر سعودی عرب کے ولی عہد عبداللہ نے اس کو پوری طرح مسترد کیا۔ مگر شاہ فہد اس وقت اجازت دینے پر مجبور ہوا جب امریکہ میں سعودی عرب کے سفیر شہزادہ بندر کو وہ جھوٹی سیٹلائٹ تصاویر دکھائی گئی جن میں عراق کو کویت میں زمین سے زمین پر مار کرنے والی میزائلوں کو نصب کئے ہوئے دکھایا گیا تھا اور ان میزائلوں کا ہدف سعودی تنصیبات بتائی گئی۔ پریشانی کی حالت میں شاہ فہد نے تین شرائط پر امریکہ کو سعودی Bases فراہم کی۔ یہ تین شرائط یہ ہیں:

۱۔ امریکہ یہ تحریری وعدہ دے کہ وہ عراقی خطرہ ٹل جانے کے بعد سعودیہ سے نکل جائے گا۔

۲۔ عراق کے خلاف کوئی بھی جنگی قدم اٹھانے سے پہلے سعودیہ سے اجازت طلب کرنی ہوگی۔

۳۔ امریکہ سعودی اجازت کو تب تک صیغہ راز رکھے گا جب تک امریکہ کا پہلا جنگی قافلہ مملکت میں داخل نہ ہو جائے۔

ابھی امریکی افواج کو اجازت دینے کا مسئلہ زیرِ غور ہی تھا کہ اسامہ بن لادن نے ایک خفیہ میٹنگ میں شہزادہ سلطان۔ سعودی وزیر دفاع۔ کو عراق کے خلاف تیس ہزار افغان

مجاہدین کی پیش کش کی مگر سلطان نے اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے شاہ فہد پر امریکہ کے حق میں اجازت دینے کے لئے دباؤ ڈالا۔ اُسامہ بن لادن نے شاہ فہد کے فیصلہ کی مخالفت شروع کی۔ سعودی علماء دو طبقوں میں بٹ گئے۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور شیخ محمد صالح العثیمین جیسے قد آور علماء کرام اس فیصلہ سے الگ رہے۔ غرض عالم اسلام بالعموم اور عالم عرب بالخصوص شاہ فہد کے اس قدم سے مشتعل ہوئے اور القاعدہ نے اس مسئلہ کو مسئلہ فلسطین کے ساتھ جوڑ کر عرب کو امریکی افواج سے پاک کرنے کا عزم کیا۔

امریکہ نے عراق کے خلاف جنگ شروع کی۔ صدام حسین نے کویت سے اپنی فوجیں واپس بلائی اور کویت پوری طرح امریکہ کے زیر اثر آ گیا۔ ۲۸ فروری ۱۹۹۱ء کو جنگ کے ختم ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صدام حسین کو اقتدار سے برطرف نہیں کیا گیا اور اس امر سے بھی منتشر ہو گیا کہ امریکہ اس کی Bases کو خالی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سعودی عوام میں پھر سے غصہ کی لہر دوڑی۔ سعودی حکومت پریشان اور مضطرب تھی اس کا عوام اپنی حکومت کے خلاف سڑکوں پر آنے کے قریب تھا۔ مگر سعودی حکومت نے جوں توں حالات کو قابو میں رکھا مگر علماء کرام نے اپنی آواز بلند کی اور سعودی عرب میں امریکہ کی اقامت پر سوالات کھڑے کئے۔

امریکہ صدام حسین کے اقتدار پر بنے رہنے کو سعودیہ میں اپنے قیام کی وجہ بتانے لگا مگر اس کی بتائی گئی اس وجہ سے لوگ مطمئن نہیں تھے اور وہ سعودیہ سے امریکی افواج کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ادھر امریکہ نے عراق کو معاشی حالت سے تباہ کرنے کے لئے اس پر سخت اقتصادی پابندیاں عائد کی، جس سے عراقی عوام مشکلات سے دوچار ہوا اور کئی جانیں دوا اور خوراک کے انتظار میں تلف ہوئیں۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد افغانستان کے صدر نجیب اللہ کی مالی حالت بدستور خستہ ہونے لگی اور اس کے لئے جنگ لڑنا کافی مشکل نظر آنے لگا۔ آخر کار اس نے اقوام متحدہ کے نمائندہ Benon Sevan کی یہ رائے مان لی کہ جب تک وہ حکومت سے

دستبردار نہ ہو جائے اقوام متحدہ کوئی امداد افغانستان کو نہیں دے سکتا۔ حالات سے پریشان صدر نجیب اللہ نے اپنے فوجی جرنیلوں سے مشورہ کئے بغیر ۱۹ مارچ ۱۹۹۲ء کو حکومت سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ اس اعلان سے اس کے فوجی پریشان ہوئے اور وہ مجاہدین کے سامنے ہتھیار ڈالنے لگے اور پورا افغانستان پہلی بار مسلم مجاہدین کے ہاتھوں میں آیا۔ ۱۵ اپریل صدر نجیب اللہ نے افغانستان سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر جنرل دوستم کی افواج نے اس کو روک لیا۔ ۱۵ اپریل کو ہی پشاور میں مجاہدین نے افغانستان کی نئی حکومت بنائی جس میں صبغۃ اللہ مجددی کو پھر ایک مرتبہ افغانستان کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسی موقعہ پر ایک کونسل قائم کی گئی جس کے ۵۱ ممبران کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ہر دو ماہ بعد ملک کے صدر کو تبدیل کرتے رہیں گے۔ اس طرح افغانستان میں پہلی مرتبہ روس کے چلے جانے کے بعد امن قائم ہوا اور افغانستان کا نام مملکت اسلامیہ افغانستان رکھا گیا۔

صدر مجددی کے بعد دوستم نے پھر ربانی نے حکومت سنبھالی مگر جب ربانی نے کونسل سے اپنی صدارت میں مزید دو ماہ کی توسیع حاصل کی تو حکمت یار نے اس پر یہ الزام لگایا کہ ربانی نے صدارت کو یرغمال بنایا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً ایک سال کے امن و امان کے بعد افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔

۱۹۹۴ء میں جنوبی افغانستان میں پشتون علماء نے کئی مجالس کا انعقاد کیا جن میں افغانستان میں جاری خانہ جنگی کے خاتمہ کے لئے تجاویز زیر غور لائی گئی۔ ان پشتون علماء نے آخر پر تین نکات پر اتفاق رائے کا اظہار کیا۔ یہ تین نکات یہ ہیں:

۱۔ افغانستان میں امن کی بحالی

۲۔ عوام سے ہتھیار چھین لینا

۳۔ افغانستان میں شریعت نافذ کرنا

چونکہ یہ پشتون علماء کمیونسٹ اقتدار سے افغانستان میں جہاد لڑ چکے تھے اس لئے ان کے حوصلے بلند تھے اور افغانستان کی موجودہ خانہ جنگی سے الگ رہ کے افغانستان کی بربادی

پر کفِ افسوس مل رہے تھے۔انہوں نے اپنی نئی فوج ''طالبان'' کے نام سے موسوم کی جس میں مدارس اسلامیہ سے وابستہ طلبا کو شامل کیا گیا اور ملا محمد عمر اخوند (۱۹۵۹ء پیدائش) کو اس کا روحانی پیشوا چنا گیا۔

ملا عمر کی شہرت افغانستان میں دن بدن بڑھتی گئی اور اس کی انصاف پسندی اور بہادری کے قصے عام ہوئے۔پاکستانی فوج اور حکومت دونوں افغانستان میں امن کے متمنی تھے اس لئے ان دونوں نے پوری طرح طالبان کو اپنی حمایت دی۔طالبان برق رفتاری سے افغانستان پر قبضہ کرنے لگا۔ملا عمر نے اپنی نئی حکومت قندھار میں قائم کی اور شرعی قوانین نافذ کرنے شروع کئے۔لوگوں سے ہتھیار چھینے گئے۔جوں ہی طالبان نے ہرات پر قبضہ کیا اور وہاں کے ایران نواز اسماعیل خان کو شکست دی تو ایران طالبان کی سخت مخالفت کرنے لگا اور طالبان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے سازشیں شروع کی۔

۱۹۹۶ء میں طالبان نے کابل پر حملے شروع کئے اور ۱۴ اپریل ۱۹۹۶ء میں ملا محمد عمر کو امیر المومنین کا خطاب دیا گیا اور اس نے افغان مسلمانوں سے بیعت لی۔اس طرح طالبان کے روحانی پیشوا کو عالمِ اسلام کے مسلمانوں کا قائد بنانے کی کوشش کی گئی۔سعودی عرب اور پاکستان نے مالی، عسکری اور سیاسی حمایت جاری رکھی اور آہستہ آہستہ طالبان افغانستان میں تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہوا۔

۱۹۹۳ء تک اسامہ بن لادن سوڈان تک اپنی پہنچ بنا چکا تھا۔اس نے وادی العقیق میں اپنے کئی کاروباری یونٹ قائم کئے تھے۔اور وہی سے القاعدہ کی کاروائی پر نظر رکھی جا رہی تھی اور جب ۱۹۹۵ء سے امریکہ نے سوڈان کو اپنے ملک سے اسامہ کو باہر نکالنے پر زور دیا تو خرطوم میں حسن الترابی نے عطیہ بدوی جو کہ سوڈان کی طرف سے پاکستان اور افغانستان میں سفیر تھا، کے ذریعہ افغان حکومت کو اسامہ بن لادن کو بحیثیت ''مہمان'' قبول کرنے پر رضامند کیا۔مئی ۱۹۹۶ء میں اسامہ بن لادن اپنے چند ساتھیوں سمیت ایک ہوائی جہاز کے ذریعے جلال آباد (افغانستان) پہنچائے گئے۔اور ۲۶-۲۷ ستمبر کی درمیانی شب طالبان

کابل پر قابض ہوا اور ۲۷ ستمبر کو افغانستان کے سابق صدر نجیب اللہ اور اس کے بھائی کو ہلاک کیا گیا۔ دوستم، ربانی، اور احمد شاہ مسعود کو موت کی سزا سنائی گئی جبکہ وہ طالبان کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے میں مصروف تھے۔ کابل بالکل خاموش ہو گیا۔ ہر طرف امن و امان قائم ہوا اور طالبان نے پورے ملک پر شرعی قوانین نافذ کیے، اور عورتوں کی تعلیم پر پابندی لگائی گئی۔ یکم جنوری ۱۹۹۷ء کو کوفی عنان نے بطرس بطرس غالی سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ لیا۔ کوفی عنان کا تقرر امریکہ نے اپنے وی ٹو کا استعمال کر کے عمل میں لایا۔

وسطی ایشیاء، روس اور ایران نے طالبان کی مخالفت شروع کی۔ ایران نے طالبان کے اس رویہ کو کافی اچھالا کہ اس نے عورتوں کی تعلیم پر پابندی لگائی اور اسے ایک غیر شرعی حکم قرار دیا۔ ۱۹۹۷ء میں طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کیا اور ۲۶ مئی کو پاکستان نے افغانستان کی طالبان حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جس کے بعد سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے بھی طالبان کو تسلیم کیا۔ اور اپنے سفارت خانے کابل میں پھر سے کھولے۔

اس طرح افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی جبکہ کچھ علاقوں میں مزاحمتی فوجیں طالبان کے خلاف لڑ رہی تھی۔ القاعدہ اور حکومت افغانستان (طالبان) کے باہمی تعلقات نے پورے عالم میں مغربی تہذیب خصوصاً امریکہ اور سرائیل کے خلاف مزاحمتی لہر تیز کی۔ ۲۳ فروری ۱۹۹۸ء میں کئی ممالک سے آئے عسکریت پسندوں نے اسامہ بن لادن کے ساتھ افغانستان میں ایک مجلس کا انعقاد کیا اور اس مجلس کے اختتام پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس کی عبارت یوں تھی:

> ''امریکی اور اس کے اتحادیوں کی افواج اور عوام کو مارنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ وہ یہ فرض کسی بھی ملک میں انجام دے سکتا ہے جہاں ممکن ہو۔ اس فرض کا مقصد یہ ہے کہ مسجدِ اقصیٰ اور مسجد حرام [مکہ] ان [مغربیوں] کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور تا کہ ان کی افواج تمام اسلامی ممالک سے شکست خوردہ نکل جائے اور وہ مسلمانوں کو دھمکانے کے لائق نہ رہے''۔[۳]

مذکورہ بیان صاف واضح کررہا ہے کہ یہ فتویٰ مغربی تسلط کے جواب میں تیار کیا گیا ہے۔اس فتوی کی زبان ردِعمل کو بیان کررہی ہے نہ کہ عمل کو۔اس کو قدرتی تہذیبی تصادم کہنا صحیح نہیں ہوگا بلکہ یہ جوابی اقدامات تھے جو مغربی ممالک کے تسلط کو ختم کرنے کے لئے ہورہے تھے۔اصل میں یہ ساری تحریکات-خواہ عسکری ہو یا علمی-اُس تسلط کو ختم کرنے کے لئے برپا ہوئی ہیں جو تسلط مغربی دنیا اسلامی دنیا پر مضبوط کرنا چاہتا ہے۔اس تسلط میں اسلامی ثقافت کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر بھی گرفتار ہورہی ہے۔اس تہذیبی تسلط کی جڑیں گیارہویں اور تیرہویں صدی کی صلیبی جنگوں میں پیوست ہے جس کی دلیل امریکہ کے صدر جارج بش کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ۱۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کو کی تھی اور افغانستان پر کئے جانیوالے حملے کو "صلیبی جنگ" (Crusade) کہا تھا۔

۱۹۹۸ء میں پہلے ہندوستان اور پھر پاکستان نے جوہری دھماکے کئے۔اس طرح پاکستان ایسا پہلا اسلامی ملک بن کر سامنے آیا جس کے پاس جوہری طاقت موجود ہے۔ اور اس ایٹم بم کو عالم اسلام میں "اسلامی بم" کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔

۷، اگست ۱۹۹۸ء نائروبی (کینیا کی راجدھانی) میں واقع امریکی سفارت خانہ کے باہر ایک طاقت ور بم دھماکہ ہوا جس میں ۲۱۶ افراد ہلاک ہوئے جن میں ۱۲ امریکی شہری تھے۔تقریباً ۴۵۰۰ افراد زخمی ہوئے۔اس دھماکہ کے ۸ منٹ بعد دارالسلام (تنزانیہ کی راجدھانی) میں واقع دوسرے امریکی سفارت خانہ کے باہر ایک طاقت ور دھماکہ ہوا۔اس دھماکہ میں ۱۱ غیر امریکی ہلاک ہوئے جبکہ ۱۰۰ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔الزام اسامہ بن لادن پر لگایا گیا مگر اسامہ نے ان دھماکوں میں ملوث ہونے سے صاف انکار کیا۔انہی دنوں امریکہ کا صدر بل کلنٹن جنسی اور جھوٹا حلف لینے کے سکنڈل سے دوچار تھا۔اس مسئلہ سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے کلنٹن نے بحرعرب سے افغانستان میں قائم کچھ افغان تربیت کیمپوں پر میزائل داغے۔مگر اسامہ وہاں موجود نہ تھا اور حملہ میں ۲۶ پاکستانی و کشمیری عسکریت پسند جاں بحق ہوئے۔

ستمبر ۱۹۹۸ء میں طالبان نے بامیان پر قبضہ کیا۔ طالبان پر اسامہ کو امریکہ کے حوالے کرنے کے لئے شدید دباؤ بڑھتا گیا۔ طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالہ کرنے سے انکار کرتا گیا اور امریکہ سے ٹھوس ثبوت مانگنے لگا۔

جولائی ۱۹۹۸ء میں نواز شریف (وزیر اعظم پاکستان) نے امریکہ سے ایک خفیہ سودا کر کے کرگل (کشمیر) سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔ جس کے جواب میں امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے پاکستان پر عائد کئی اقتصادی پابندیاں نرم کر دیں، جو پابندیاں ۱۹۹۸ء میں نیوکلیائی تجربہ کرنے کی پاداش میں ان پر لگائی گئی تھیں۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء پاکستان کے فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف نے اچانک نواز شریف کا تختہ اُلٹ دیا اور نواز شریف کو قید کیا گیا۔

جوں جوں افغانستان پر اسامہ امریکہ کے حوالے کرنے کا دباؤ بڑھتا گیا، طالبان بھی اپنے انکار میں سخت ہوتا چلا گیا۔ ۱۰ مارچ ۲۰۰۱ء کو طالبان نے ۱۵۰۰ سالہ قدیم بدھ کی مورتیاں توڑنے کا حکم دیا۔ اس قدم کی عالمی سطح پر مخالفت ہوئی اور طالبان عالمی سطح پر اپنی ساکھ خراب کرتا گیا۔

۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان کے مشہور جنگجو اور سوویت یونین کے خلاف لڑنے والا مجاہد احمد شاہ مسعود ایک بم دھماکہ میں جاں بحق ہوا۔ ۱۱ ستمبر ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیویارک اور پنٹاگن پر ہوائی جہازوں سے حملہ ہوا۔ پورے امریکہ میں عدم تحفظ کے بادل چھا گئے۔ ان حملوں سے پورا عالم دہل گیا۔ ہزاروں انسان ان حملوں میں ہلاک ہوئے۔ امریکہ کی پوری مشینری شش و پنج میں مبتلا ہوئی۔ طالبان نے اسی روز حملہ کی مذمت کی پھر الزام اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر آیا مگر اسامہ نے اس الزام کو خارج کرتے ہوئے کہا:

''میں ۱۱ ستمبر کے حملوں کا ذمہ دار نہیں ہوں لیکن میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ یہ مظلوموں کا ظالموں کے ظلم کے خلاف ردعمل ہے''۔[۴]

عراق نے لیبیا اور چین کی طرح یو این مشن پر اپنے پرچم کو سرنگوں کرنے سے انکار کیا

اور اپنے ایک بیان میں امریکہ پر یہ الزام لگایا کہ امریکہ وہی کانٹے کاٹ رہا ہے جو اس کے حکمرانوں نے بوئے ہیں۔ امریکہ نے افغانستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ جلد از جلد اسامہ کو ان کے حوالے کرے مگر افغانستان بدستور انکار کرتا رہا۔ ادھر افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے پاکستان امریکہ کے لئے وہی حیثیت رکھتا تھا جو حیثیت ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب امریکہ کے لئے رکھتا تھا۔ امریکہ نے پرویز مشرف پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ امریکی افواج کے لئے اپنی سرزمین میں Bases فراہم کرے۔ مگر یہ معاملہ پاکستان کے لئے بہت ہی پیچیدہ تھا۔ اس نے طالبان کو پروان چڑھایا تھا اور آخر کار پاکستان نے مجبور ہو کر امریکہ کو اس شرط پر اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دی کہ امریکہ شمالی اتحاد کو آگے نہیں لائے گا کیونکہ شمالی اتحاد پاکستان کے سخت خلاف تھا اور اس کی حمایت روس، ایران اور بھارت کر رہے تھے۔ امریکہ نے یہ شرط مان تو لی مگر جلد ہی حسب دستور اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کی۔

۲۰ ستمبر ۲۰۰۱ء کو طالبان نے ایک ہنگامی مجلس بلائی جس میں امریکہ میں ہوئی ہلاکتوں پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ یو این اور آئی سی او کے ذریعہ اس واقعہ کی تحقیقات کی جائے۔ اس کونسل نے افغانستان کی امارت کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اسامہ بن لادن کو افغانستان سے چلے جانے کے لئے راضی کرے۔ ساتھ ہی اس مجلس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اگر امریکہ افغانستان پر حملہ کرتا ہے تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس اعلان کے آتے ہی پاکستان نے کابل سے اپنے سفارتی عملہ کو واپس بلایا۔ پاکستانی ٹی وی سے پاکستانی نیشنلزم پر مبنی اشتہار آنے لگے جس میں ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ زیادہ مشہور ہوا۔ امریکہ نے ''صلیبی جنگوں'' کا اعلان کیا۔ ۲۵ ستمبر کو سعودی عرب نے طالبان سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کئے۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادی افواج کا حملہ شروع ہوا۔ امریکہ نے پہلے اس اپریشن کا نام مذہبی اصطلاح کے مطابق Infinite Justice (لامتناہی انصاف) رکھا تھا۔ جب مسلم دنیا میں اس نام کی مخالفت ہوئی تو امریکہ

نے اس آپریشن کا نام بدل کر Enduring Freedom رکھ دیا۔ ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی شب طالبان کابل سے دستبردار ہوئے اور قندھار کی راہ لی۔ اسلام آباد پاکستان میں موجود افغانی سفارت خانہ بند کر دیا گیا۔ ۱۳ نومبر شام تک کابل پر قومی اتحاد (National Alliance) کے جماعت اسلامی گروہ نے قبضہ جما لیا تھا۔ برطانیہ کی بی بی سی نیوز چنل اور امریکہ کی سی این این نیوز چنل نے کابل میں لوگوں کو داڑھیاں مونڈتے اور کاٹتے ہوئے دکھایا جبکہ عورتیں پردہ سے باہر آتی ہوئی فخر محسوس کر رہی تھی۔

پرویز مشرف نے جب دیکھا کہ کابل پر شمالی اتحاد قابض ہو رہا ہے تو وہ کابل پر بین الاقوامی فوج کی تعیناتی کا مطالبہ کرنے لگا۔ ۱۷ نومبر ۲۰۰۱ء کو برہان الدین ربانی - سابقہ صدر - کابل میں داخل ہوا۔ کچھ دن بعد ایران نے اپنا سفارتی خانہ کابل میں دوبارہ کھولا۔ ۵ دسمبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان میں عارضی حکومت قائم کی گئی جس کا چیرمین ۱۹۹۲ء میں صدر برہان الدین ربانی کی حکومت کے تحت رہے خارجہ وزیر - حامد کرزائی - کو چنا گیا۔ ۱۸ دسمبر کو امریکی بمباری روک دی گئی۔ اگرچہ سرکاری طور پر طالبان کے خلاف جنگ بڑے پیمانے پر ختم ہوئی ہے مگر اب بھی کئی علاقوں میں طالبان کی طرف سے مزاحمت جاری ہے۔

۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اقوام متحدہ کو ایک طرف رکھ کر عراق پر حملہ شروع کیا۔ اس بار سعودی عرب کے انکار کے بعد امریکہ نے عراق پر اپنا حملہ کویت کی Bases سے شروع کیا۔ ۹ اپریل کو امریکی فوج اور توپیں بغداد میں داخل ہوئیں اور صدام حسین کے مجسمہ کو مسمار کیا گیا اور یکم مئی کو امریکہ کے صدر جارج بش نے عراق میں جنگ کے خاتمہ کا اعلان کیا اور امریکی منتظم Paul Bremer کو عراق کا نظم و نسق چلانے کے لئے معمور کیا گیا۔ مگر عراق پھر بھی خاموش نہیں ہوا اور فلوجہ میں مقتدیٰ الصدر اور دیگر جنگجوؤں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو کافی جانی و مالی نقصانات پہنچانا جاری رکھا۔

عراق کے خلاف دوسری جنگ شروع کرنا اصل میں امریکہ کے مفادات کو تحفظ بخشنے کی جنگ ہے۔ سب سے پہلے صدر بش نے عراق کے صدر صدام حسین پر القاعدہ اور بن

لادن کے ساتھ تعلقات ہونے کا الزام لگایا۔ پھر عراق پر یہ الزام لگایا گیا کہ عراق بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (WMD) بنا رہا ہے اور ان کو مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اتحادیوں (خصوصاً اسرائیل) کے خلاف استعمال کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ان الزامات کی آڑ میں امریکہ نے عراق پر حملے کی تیاری شروع کی جس سے وہ دنیا کے عظیم تیل کے ذخائر کو اپنے لئے خاص کرنا چاہتا تھا اور مشرق وسطیٰ کے سیاسی نقشہ کو اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق کھینچنا چاہتا تھا۔

امریکہ کے نائب سیکریٹری برائے دفاع کولن پول (Colin Powell) نے ۲۰۰۲ء میں صدام حسین کو اپنے ہتھیار ختم نہ کرنے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی تھی اور جواب میں صدام حسین نے اقوام متحدہ کے چیف انسپکٹر Hans Blix کو عراق میں WMD ڈھونڈنے کی اجازت بھی دی تھی۔ فروری ۲۰۰۳ء میں پول نے عراق پر اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کو دھوکہ دینے کا الزام لگایا اور سلامتی کونسل سے مطالبہ کیا کہ وہ عراق پر قرارداد ۱۴۴۱ کی خلاف ورزی کا الزام لگائے۔[۵] اور عراق کے خلاف جنگ کو جائز قرار دے۔ مگر سلامتی کونسل میں اکثریت نے اس کو مسترد کر دیا۔ افغان مسئلہ کی طرح اس بار بھی بش کو ٹونی بلیر -وزیر اعظم برطانیہ- نے پورا تعاون دینے کا وعدہ کرتے ہوئے امریکہ کی پیٹ تھپ تھپائی۔ جنگ اقوام متحدہ کی اجازت کے بغیر شروع کی گئی اور اس کو برحق رنگ دینے کے لئے اس کا نام Operation Iraqi Freedom رکھ دیا گیا۔

ان طویل تاریخ وار حالیہ گزرے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد صرف قاری کے ذہن میں سیاسی دنیا کا نقشہ کھینچنا تھا تاکہ وہ پوری طرح جدید سیاسی دنیا کے سیاہ و سفید سے متعارف ہوں۔

مغربی تہذیب کے جدید اور تہذیب کش عناصر

سموئیل کے مطابق دنیا اس وقت تہذیبوں میں بٹی ہوئی ہے اور اگر اس کے الفاظ کو

پوری طرح دیکھا جائے تو وہ بھی اس امر سے متفق ہے کہ دنیا اس وقت حسب سابقہ مذہبی خطوط پر بٹی ہوئی ہے۔ ہر طرف مذہب نمایاں ہے۔ اور تہذیبیں اصل میں مذہب ہی کی پیداوار ہیں۔ اگر مذہب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جائے تو پوری تہذیب مسخ ہو جاتی ہے اور جب تہذیب کے کسی عنصر کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بالفاظ دیگر مذہب کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ سموئیل تہذیبوں کے رہنما ممالک (Core States) کی جو بات کہہ رہے ہیں وہ اصل میں مذہبوں کے قائد اور رہنما ملک ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کی ہے کہ جب کسی ملک میں مذہب ختم کیا جاتا ہے تو وہاں موجود کوئی فلسفہ یا غیر الٰہی فکر مذہب کی جگہ لیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اسوقت دنیا میں مختلف مذاہب کے درمیان ایک ''تصادم'' برپا ہے جس کو تہذیبی تصادم کا نام دے کر اس کے نتائج کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔

کسی بھی ملک کی خارجہ، دفاعی، اقتصادی، سیاسی پالیسی اس ملک میں غالب مذہب کے مطابق طے ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ ملک قانونی طور پر سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ وغیرہ میں رہنے والی اکثریت عیسائی ہے۔ اس لئے یہ ممالک اپنے ادارہ جات کو عیسائی نقطہ نگاہ اور عیسائی مفادات کے مطابق استوار کرتے ہیں۔ جبکہ چین کے ادارہ جات کنفیوشن مت اور بدھ مت کو زیر نظر رکھ کر استوار کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ چین سرکاری طور پر لامذہب ملک ہے۔ اسی طرح پاکستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش، سعودی عرب، ترکی، سومالیہ، الجیریا وغیرہ ممالک اپنے ادارہ جات میں اسلامی نقطۂ نظر رکھتے ہیں جبکہ نیپال اور بھارت ہندوازم اور اسرائیل یہودیت کو اپنی سیاست وغیرہ سے الگ نہیں کر سکتے۔

اب اگر ہم مغربی تہذیب سے وابستہ ممالک کو دیکھیں تو یہ امر واضح ہے کہ ان ممالک میں عیسائیت کو غلبہ حاصل ہے اور اسی بنیاد پر پوری مغربی تہذیب عیسائیت کی عکاسی کرتی ہے۔ جہاں تک مذاہب یا تہذیبوں کے رہنما ممالک کا تعلق ہے تو اسلامی تہذیب واحد

ایسی تہذیب ہے جس کا کوئی رہنما ملک نہیں ہے اور اگر اقتصادی اور فوجی نوعیت سے دیکھا جائے تو سعودی عرب اور پاکستان موجودہ دور میں اسلامی تہذیب کی قیادت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ مغربی تہذیب کی قیادت کر رہا ہے جس میں برطانیہ اس کا نائب بنا ہوا ہے۔ جبکہ روس آرتھوڈاکس اور کمیونزم کی قیادت کر رہا ہے اور اسرائیل اور بھارت بالترتیب یہودیت اور ہندوازم کی کور سٹیٹ (Core State) بنے ہوئے ہیں۔

یہ حقیقت قابل غور ہے کہ امریکہ سے قبل یورپ مغربی تہذیب کی نمائندگی کرتا رہا ہے مگر بعد میں جب امریکہ نے سرد جنگ کے دوران یورپ کی جگہ لے لی تو یورپ نے امریکہ کی اقتداء کرنے میں ہی اپنے لئے عزت سمجھی۔ امریکہ جو کہ اس وقت دنیا کے تمام ممالک میں سے ایک عظیم اقتصادی اور فوجی قوت ہے دوسرے بڑے ممالک کے مقابلے میں جدید اور نیا ملک ہے۔ اس کے وجود کی داستان صرف ۲۰۰ سال پرانی ہے۔ اس نے موجودہ صورت بیسویں صدی میں اختیار کی۔ امریکہ بذات خود ایک یورپی کالونی رہ چکا ہے اور بیسویں صدی میں یہ بحیثیت ایک عالمی طاقت کے اُبھرا جبکہ دوسری جنگ عظیم سے لیکر اس کو دنیا کے بڑے طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمہ اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد یہ دنیا کا ایک واحد طاقتور ملک بن کر اُبھرا۔

پہلے پہلے امریکہ کی پالیسی بالکل نرم تھی وہ خود ایک نو آبادی رہ چکا تھا اور اسی لئے یورپی طاقتوں سے دور رہ کر دنیا کے لئے امن اور جمہوریت کی مثال بننا چاہتا تھا۔ مگر امریکی خانہ جنگی (۱۸۵۰-۱۸۶۰) کے بعد امریکہ کی معیشت دن بدن ترقی کر رہی تھی اور کئی ناقدین کا خیال ہوا کہ چونکہ امریکہ دن بدن اقتصادی سطح پر ترقی کر رہا ہے اس لئے اس میں دنیا کی سیاست کو موڑنے کی طاقت پنہاں ہے۔ امریکہ کی آبادی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ اس کی زرعی اور صنعتی پیداوار اپنے لئے منڈیوں کی مانگ کر رہی تھی۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے امریکہ اپنے سابقہ خیال سے انحراف کرتے ہوئے بذات خود ایک استعماری طاقت بن بیٹھا۔ اس نے یورپی "تہذیبی مشن" اور عیسائیت کو دنیا پر غالب کرنے

کا بیڑا اٹھالیا اور ایک نو آبادی خود اپنے لئے نو آبادیاں تلاش کرنے کے لئے نکل پڑی۔ اسی دوران ۱۸۹۸ء میں میوانا بندرگاہ پر امریکی پن ڈبی میں عجیب وغریب ڈھنگ سے ہوئے دھماکہ کے بعد اچانک امریکہ اور اسپین میں ایک مختصر سی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ نے پوری طرح امریکہ کو بدل کے رکھ دیا۔ امریکہ عالمی سیاست میں ایک مضبوط اقتصادی ملک کے بطور وارد ہوا جس نے آگے چل کر پورے مغرب کی قیادت کرتے ہوئے مغربی تہذیب کی Core State ہونے کا شرف حاصل کیا۔

یہ امر واضح ہے کہ جب کسی تہذیب کو طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ طاقت کا صحیح استعمال کر کے اپنی تہذیب میں مثبت ترقی کرتا ہے یا پھر وہ اس طاقت کا بیجا استعمال کر کے دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں پر تسلط قائم کرتا ہے۔ موجودہ تہذیبوں میں مغربی تہذیب نے اپنے پھیلاؤ کے لئے دیگر مشرقی تہذیبوں کے خلاف طاقت کا استعمال کیا ہے۔ اگر عمومی طور پر دیکھا جائے تو اولاً کسی بھی تہذیب پر دوسری تہذیب اپنے فن، زبان، ادب وغیرہ کی بنیاد پر سبقت لیتی ہے مگر موجودہ دور میں مغربی تہذیب نے اپنی قومی اقتصادی حالت کی بناء پر اور طاقت کے بل پر مشرقی تہذیبوں پر سبقت لی ہے اور اس طرح مشرقی تہذیبوں خصوصاً اسلامی دنیا کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اس امر کا اقرار خود سموئیل بھی یوں کرتے ہیں:

> ''مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقدار یا مذہب کی برتری کی وجہ سے نہیں جیتا بلکہ اس نے منظم تشدد کے استعمال میں حاصل برتری کی وجہ سے دنیا کو جیت لیا ہے۔ مغربی اکثر اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں جبکہ غیر مغربی کبھی نہیں بھولتے''۔[۶]

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ دوسری نابود ہو چکی تہذیبوں کی طرح غرور اور تکبر کی شکار ہو چکی ہے۔ اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے یہ اپنی بالادستی اور غلبہ کو دائمی اور پائیدار بنانے کے لئے اس کشمکش میں مشغول ہے کہ کسی طرح دوسری تہذیبوں اور اقوام کو مغلوب اور کمزور بنا دیا جائے۔ اگر کوئی دوسری تہذیب یا قوم ترقی کی راہ پر بغیر رکاوٹ مشغولِ سفر رہتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ قوم یا تہذیب آگے چل کر مغربی تہذیب

کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی بالادستی کو للکار سکتی ہے اور اس کے مدمقابل بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی ہے۔ اگرچہ یہ قانونِ قدرت ہے مگر مغربی تہذیب اس قانونِ قدرت کو دنیا میں لاگو ہونے سے دور رکھنا چاہتی ہے اور اس کے نتیجہ میں مغربی تہذیب بذاتِ خود دوسری تہذیبوں کے خلاف ہمیشہ ایک تصادم جاری رکھتی ہے جو اصل میں مغربی تسلط کا ثمر ہے اور غیر فطری بھی۔

یہ واضح حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبیں عروج و زوال کے قانونِ قدرت سے گزرتی ہیں۔ کوئی بھی تہذیب جو آج مفلوک الحال ہے کل بتدریج بامِ عروج و ترقی پر پہنچ سکتی ہے اور اسی طرح اس کے برعکس ہونا بھی کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے۔ مگر مغربی تہذیب جس کی نمائندگی موجودہ دور میں امریکہ کر رہا ہے اس قانونِ قدرت کے خلاف جا کر اپنی بالادستی و برتری کو محفوظ کرنا چاہتی ہے جو بالفاظ دیگر زمانہ کی گردش کو روکنے کے مترادف ہے، کیونکہ زمانہ دائمی تغیر کا مطالبہ کرتا ہے اور یہی تغیر تہذیب و اقوام کے حالات بھی بدل دیتا ہے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے مغربی تہذیب اپنے بنیادی عناصر کو تقویت پہنچانے کے بجائے دوسری تہذیبوں کی بنیادوں کو بتدریج کھوکھلا کرنا چاہتی ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو امریکہ جو اس وقت مغربی تہذیب کی قیادت کر رہا ہے رفتہ رفتہ اپنی تہذیب کے بنیادی عناصر میں فساد اور خستہ حالی میں اضافہ ہوتا دیکھ رہا ہے مگر اس فساد اور خستہ حالی پر ماتم کناں ہونے کے بجائے اس تہذیب کے علم بردار دوسری تہذیبوں کے بنیادی اور مضبوط ادارہ جات کو کمزور کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ان کوششوں اور کاوشوں کو کامیاب بنانے کے لئے مغربی تہذیب اس وقت پوری دنیا میں چند تہذیب کش عناصر کا بے تحاشہ استعمال کر رہی ہے جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

ذرائع ابلاغ (Media)

دنیا اس وقت عجیب شش و پنج میں مبتلا ہے۔ اگرچہ ہر طرف سے معلومات کا سیلاب

آرہا ہے مگر دوسری طرف سے ان حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی سعی بھی ہورہی ہے تاکہ عام آدمی اصلی حالات سے بالکل بے بہرہ رہے۔ ذرائع ابلاغ پوری طرح مغربی تسلط کا شکار ہوا ہے جبکہ اسلامی ممالک کا ذرائع ابلاغ پوری طرح اپنی حکومتوں کی لونڈی بنا ہوا ہے۔ خبر خبر نہیں بلکہ تسلط و ظلم کا ایک خوبصورت آلہ بن چکا ہے۔ ان خبروں کو چھپایا جاتا ہے جو خبریں کسی بھی طرح مغربی تہذیب کو نقصان پہنچا سکتی ہوں یا اسلامی و مشرقی تہذیب میں خود اعتمادی اور جان پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہوں۔ اس لئے ہم جس حالت کو معلوماتی مہم (Information Campaign) کہتے ہیں وہ اصل میں معلومات کش مہم (Anti-Information Campaign) ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اس وقت دس مشہور اقسام ہیں جن کا استعمال مغربی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ اقسام یہ ہیں:

۱۔ ریڈیو
۲۔ ٹیلی ویژن
۳۔ اخبار، جرائد اور ان کی قسمیں
۴۔ انٹرنیٹ
۵۔ کتاب
۶۔ اشتہارات اور اس کی قسمیں مثلاً ہوورڈنگ، اسٹیکر وغیرہ۔
۷۔ تمثیل
۸۔ نغمہ
۹۔ فلم
۱۰۔ فن، حسن اور ملبوسات کی نمائش۔

چونکہ موجودہ دور کا ذرائع ابلاغ اس وقت پوری طرح بظاہر مغربی تہذیب کے ہاتھ میں ہے، اگر کسی جگہ کوئی آزاد ذرائع ابلاغ کام کر رہا ہے وہ بھی اپنا ذریعہ کسی مغربی خبر رساں ایجنسی کو بنانے پر مجبور ہے۔ اس لئے اس کی آزادی کا لیبل اس کی محکومی کو کسی حد

تک چھپاتی ہے۔ سرد جنگ، خلیجی جنگ، افغان جنگ، دوسری خلیجی جنگ وغیرہ میں اس آلہ کا بے تحاشہ استعمال کیا گیا۔ مغربی تہذیب نے حالات اور لوگوں کی سوچ کا رُخ اپنے حق میں منتقل کرنے میں اس ذرائع ابلاغ کا کافی حد تک استعمال کیا۔

سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کو God less تہذیب کا نام دیا گیا اور اس کے خلاف لڑنے والوں کو مجاہدین کے نام سے یاد کیا گیا۔ جبکہ امریکہ افغان جنگ میں انہی مجاہدین پہ ''دہشت گرد'' کی لیبل چسپان کی گئی۔ ایران عراق جنگ کے دوران صدام حسین کو بحیثیت ہیرو (Hero) پیش کیا گیا اور عراق امریکہ جنگ کے دوران اسی ہیرو کو ''ڈاکو'' اور ''دہشت گرد'' پکارا گیا۔ اس طرح ذرائع ابلاغ کے ذریعہ لوگوں کے اذہان بدلنے، ان کی سوچ موڑنے اور ان کی رائے اپنے حق میں منتقل کرنے میں اس آلہ کو بے تحاشہ استعمال کیا گیا۔

دورِ حاضر میں عرب دنیا میں ''الجزیرہ'' نام کی ایک ایسی عربی چنل شروع ہوئی ہے جس نے کسی حد تک اپنے ذرائع سے خبر دینے کی کوشش کی ہے۔ قطر سے چالو اس چینل نے کئی جنگوں کے دوران امریکہ کی جنگی بربریت کو بے نقاب کیا۔ افغان امریکہ جنگ کے دوران امریکہ نے کابل میں موجود الجزیرہ کے دفتر پر ہوائی حملہ کر کے اس کی ساکھ کو اور زیادہ مستحکم کیا ہے۔ یہ حملہ ۱۴ نومبر ۲۰۰۱ء کو کیا گیا۔ اس حملہ سے پہلے الجزیرہ دنیا کی واحد چینل تھی جس نے افغانستان میں امریکی بمباری سے ہوئے جانی اور مالی نقصان کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور یہ واحد نیوز چینل تھی جس کے نامہ نگاروں کو طالبان نے افغانستان میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ اور امریکہ نے اس پر بن لادن کا پروپگنڈہ آلہ ہونے کا الزام لگایا تھا۔

الجزیرہ نومبر ۱۹۹۶ء میں رسمی طور پر قطر میں شروع کی گئی۔ اس کے نامہ نگار اکثر بی بی سی سے تربیت یافتہ ہے جو اپریل ۱۹۹۶ء میں بی بی سی سے الگ ہو کر نومبر میں الجزیرہ کے لئے کام کرنے لگے۔ الجزیرہ نے عرب دنیا میں عرب خاندانی حکومتوں، عرب اسرائیل تعلقات، اسلام اور دیگر مذاہب جیسے موضوعات پر بحث و تمحیص کے ذریعہ ایک بیداری کی لہر برپا کی ہے۔ اس کی کامیابی کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ جب اکتوبر ۲۰۰۱ء

میں قطر کے حکمران شیخ حماد بن خلیفہ الثانی واشنگٹن کے دورے پر تھے تو پاول نے ان سے ''الجزیرہ کو لگام لگانے'' کے لئے کہا۔ شیخ حماد نے بعد میں دی گئی پریس کانفرنس میں امریکہ کی اس گزارش کو ''نصیحت'' کہتے ہوئے مسترد کیا۔

اپنی اقامت کے چند سال بعد ہی الجزیرہ نے اس وقت دنیا میں ایک ہلچل مچادی جب ۹ اور ۱۰ اگست ۱۹۹۹ء کی درمیانی رات اسلام آباد اور کوئٹہ میں امریکہ کی خصوصی ٹیمیں اسامہ بن لادن کو پکڑنے کے لئے وارد ہوئیں۔ الجزیرہ کو اس منصوبہ کا پتہ چلتے ہی امریکہ نے اس پر اس خبر کو چھپانے کا دباؤ ڈالا۔ مگر الجزیرہ نے اس خبر کو نشر کیا جس کی بعد میں امریکہ نے شدید مخالفت اور تردید کی۔ اس خبر سے اس معاہدہ کے بارے میں بھی دنیا کو ہوا لگی جو معاہدہ نواز شریف اور بل کلنٹن کے درمیان کرگل جنگ کو ختم کرنے کے لئے وائٹ ہاؤس میں ۴ جولائی ۱۹۹۹ء کو ہوا تھا۔ جو معاہدہ بعد میں نواز شریف کے خلاف فوجی بغاوت کی ایک وجہ بن گیا۔

ذرائع ابلاغ کو جہاں مغرب نے اپنی بالادستی بنانے اور بڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے وہیں اس ذرائع ابلاغ کو مغربی طاقتیں مشرقی تہذیبوں کے وہ عناصر ختم کرنے کے لئے بھی استعمال کرتی ہیں جو عناصر ان تہذیبوں میں جاذبیت اور کشش پیدا کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب اپنے اخلاقی پہلو سے ایک آفاقی اپیل رکھتی ہے اور اس اخلاقی پہلو کو پوری طرح برباد کرنے کے لئے اس ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔ Freud کے نظریۂ جنس (Libido) کا استعمال کرکے اسلامی اقدار کے خلاف ایک منصوبہ بند تحریک چلائی جاتی ہے۔ اس طرح عیاشی اور جنسیت کا استعمال کرکے اسلامی تہذیب کو مردہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ مسلم عوام ذہنی ارتداد کا شکار ہوکر مذہب سے بغاوت کا اعلان کریں اور دینی عزیمت اور حمیت اس میں باقی نہ رہے اور وہ بہ آسانی مغربی تسلط میں آسکیں۔

> ''سیکولرائزیشن کی عملی کوششوں کے ذیل میں انہوں نے پہلے تو انفرادی طور پر اباحیت پسند، عیاش اور آزاد پسند اشخاص کو مذہب اور پاکیزگی سے بغاوت کی طرف اُبھارا بعد میں اس کی باضابطہ اجتماعی کوششیں اور تحریکیں شروع کی

گئیں۔ ان کا مقصد معاشرے میں جنسیت کو رواج دینا تھا تا کہ وہ ہر مذہبی بغاوت کا راستہ ہموار کر سکیں۔ اس پر باضابطہ ضخیم کتابیں تحریر کی گئیں اور عملی طور پر معاشرے میں ان تحریکوں کو آگے بڑھایا گیا۔"[۷]

انسانی حقوق (Human Rights)

انسانی حقوق کا تحفظ ہر مذہب میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے ہر ایک تہذیب ان کے تحفظ کو اپنے حق میں اعزاز اور ان کی پامالی اپنے لئے اہانت سمجھتی ہے۔ مغربی دانشور اُن حقوق کو انسانی حقوق مانتے ہیں جو حقوق ایک فرد کو بحیثیت انسان حاصل ہیں۔ Universal Declaration of Human Rights کی پہلی دفعہ کے مطابق:

"تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں اور عزت و حقوق کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ ان کو عقل اور ضمیر عطا کیا گیا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارگی کی روح کے تحت سلوک کرنا چاہیے"۔[۸]

مگر دیگر بین الاقوامی قوانین کی طرح یہ اعلان بھی محض سیاست گری کا شکار ہوا ہے۔ اس اعلان کو بحیثیت آلہ استعمال کیا جاتا ہے تا کہ اس خوبصورت اصطلاح اور اعلان کی آڑ میں اپنے مفادات کو حاصل کیا جا سکے۔ اکثر دفعہ مغربی ممالک مشرقی ممالک پر بالعموم اور اسلامی ممالک پر بالخصوص انسانی حقوق کی پامالی کا الزام لگاتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی صرفِ نظر نہیں کی جا سکتی کہ مشرقی ممالک میں بھی انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے علمبردار خود اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں اور وہ ان حقوق کی آڑ میں اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جہاں کسی ایک ملک میں ایک آدمی کا بے وجہ قتل ان علمبرداروں کی نیند حرام کرتا ہے وہی دوسرے ممالک میں ۱۰۰ معصوم آدمیوں کی بے دردانہ قتل و غارت صرفِ نظر کی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دہرے معیار کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

دوسری جنگ عظیم کے بعد-۱۹۴۸ء میں- جنرل اسمبلی (اقوام متحدہ) نے اس اعلان کو جاری کر کے بظاہر ایک خوبصورت اور قابلِ ستائش کام عمل میں لایا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ تب سے لیکر آج تک اس بین الاقوامی قانون نے صرف مغربی ممالک اور مغربی تہذیب کے مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں قائم Amnesty International کی سالانہ رپورٹوں سے صاف واضح ہے کہ ان تنظیموں کے ذریعے مظلوم و مجبور کی بے کسی و بے بسی پر خاص مفادات کو ترجیح دے کر سیاسی چالیں کھیلی جاتی ہیں۔ اگر کوئی ملک مغرب کے مفادات میں رخنہ ڈالنے کی طاقت رکھتا ہے تو مغرب اس ملک میں ہو رہی ''انسانی حقوق کی پامالی'' کو اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پوری دنیا میں اُچھالتا ہے اور پھر انسانی حقوق کے تحفظ کے نام کے تحت اقوام متحدہ کی امن فوج (Peace Keeping Force) بھیج کر اس ملک کے اندرونی معاملات میں اپنی مداخلت ممکن بناتا ہے۔

جہاں طالبان، صدام حسین وغیرہ کے انسانی حقوق سے متعلق معاملات مغربی میڈیا کی توجہ کے خاص مرکز رہتے ہیں وہیں اسرائیل، روس، برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے ہو رہی انسانی حقوق کی پامالی پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ ۱۹۹۶ء میں جب پاکستان نے بھارت کے خلاف یو این کمیشن برائے انسانی حقوق کے سامنے کشمیر میں جاری انسانی حقوق کی پامالی کو پیش کرنا چاہا تو ایران اور چین- جو دونوں پاکستان کے گہرے دوست ممالک ہیں- نے پاکستان کو اپنی قرارداد واپس لینے کے لئے مجبور کیا، کیونکہ اولاً دونوں ممالک کے ذاتی مفادات اس سے مجروح ہوتے تھے دوم دونوں ممالک یہ بھی جانتے تھے کہ اس سے مغرب کے ان منصوبوں کی تکمیل کے لئے ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جس سے وہ اپنے مقاصد و مفادات حاصل کرنے کے لئے بالعموم پورے ایشیا اور بالخصوص جنوبی ایشیا میں اپنی مداخلت پوری طرح ممکن بنا سکتا تھا۔

مذہب ہر ایک پالیسی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ثقافت یا مذہب میں کسی قسم کے فرق کا واقع ہونا تجارت سے لیکر انسانی حقوق کے مسئلہ تک اپنا اثر وارد کرتا ہے۔[9] یہی وجہ ہے کہ

جہاں مسلم آبادی کا نام ونشان مٹانے کی کوشش ہورہی ہے وہاں ہورہی انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر مغرب خاموش تماشائی نظر آتا ہے اور جہاں کسی غیر مسلم کا خون بہتا ہے تو وہاں مغرب انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر اس کی حمایت کو پہنچ جاتا ہے۔

وطن پرستی (Nationalism)

وطن پرستی (Nationalism) سے مراد اپنے وطن سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنا ہے۔ جس میں اپنے ملکی مفادات کو عالم انسانیت کے مفادات پر ترجیح دینا ہے۔ وطن پرستی کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہر ایک آدمی پر یہ بنیادی ذمہ داری عائد ہے کہ وہ پوری دنیا کے مفادات کے بارے میں سوچنے سے قبل اپنے ملک کے حق میں سوچے۔ یہ نظریہ جغرافیائی مقاربت واتصال یا ثقافتی مماثلت یا تاریخی رشتہ کی بنیاد پر افراد کو ایک جماعت کی شکل فراہم کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں Nation States قائم ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مذہبی قومیت ماورائے وطن (Transnational) ہوا کرتی ہے۔ جس میں کسی بھی ملک، ثقافت یا تاریخ سے وابستہ افراد ایک جماعت تشکیل دیتے ہیں۔ یہ جماعت اپنے مذہبی رشتہ کی وجہ سے متحد رہ کر اپنی الگ پہنچان بناتی ہیں جو اصل میں ایک وسیع تہذیب کو جنم دیتی ہے۔ یہ جماعت ملکی اور علاقائی مفادات سے بالاتر ہوکر اپنے مذہب کے بارے میں فکرمند رہتی ہے اور اپنے ملکی مفادات کو اپنے مذہبی مفادات پر قربان کرنا اپنے لئے بنیادی ذمہ داری سمجھتی ہے۔ اکثر دفعہ کسی قوم کی بنیاد زبان، مذہب، نسل وغیرہ پر ہوتی ہے مگر مذہبی قومیت زبان، نسل اور جغرافیائی مقاربت واتصال کی پابند نہیں رہتی۔ وطن پرستی مذہبی قومیت کو بکھیر دیتی ہے اور اس کو کمزور اور منقسم کرتی ہے اور ایک انسان کے تشخص (Identity) کو مذہب سے الگ کرکے قوم وملک سے جوڑتی ہے۔

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ وطن پرستی اولاً اٹھارویں صدی عیسویں میں اُبھرنے لگی اور انیسویں صدی میں اسلامی دنیا پر پوری طرح چھا گئی۔ قوم پرستی مغربی دنیا سے اسلامی

دنیا میں منتقل ہوئی اور آگے چل کر کمالیت کے چھ بنیادی عناصر میں سے ایک عنصر بن گئی۔ جب تک عثمانی سلطنت طاقت اور بالادستی سے متصف رہی مغربی وطن پرستی کا نظریہ اسلامی سلطنت میں ناکام رہا۔[11] مگر عثمانی سلطنت کا زوال مغربی وطن پرستی کے حق میں غذا ثابت ہونے لگا۔ کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کو کمزور کرنے کے لئے یا تو ان کو اندرونی فساد میں مبتلا کیا جاتا ہے یا پھر ان کے اتحاد کو علاقہ جات، زبان، نسل، تاریخ، کلچر وغیرہ ناموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اس مذہبی قوم کی یکجہتی کی عمارت مسمار ہو کر بکھر جاتی ہے اور ہر ایک ٹولہ اپنے لئے الگ الگ عمارت تعمیر کرنے لگتا ہے۔ جس سے ان کا مذہبی یا ملی مفاد ملکی مفادات کے سامنے اپنی کشش کھو بیٹھتا ہے۔ اور ان کا ایک ملی ہدف کئی ملکی ہدفوں میں اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ ان کی واحد قیادت کئی ملکوں کی قیادتوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ جس سے یہ مختلف ملک ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے ملکی مفادات کے لئے ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں۔ غرض ایک ہی تہذیب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان میں کبھی کبھار جنگ و جدل بھی ہوتی ہے۔ جس کی واضح مثال ایران عراق، عراق کویت، ایران طالبان، پاکستان طالبان وغیرہ کے درمیان ہوئے تصادم اور تضادات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

اگر کبھی قوم پرستی کسی تہذیب کو توڑ نہیں پا رہی ہو تو علاقائی عصبیتوں (Regionalism) کو ہوا دیکر اسے پارہ پارہ کیا جاتا ہے۔ اکثر اس عصبیت کی اصل وجہ لسانی یا نسلی اختلاف ہوتا ہے۔ یورپی استعماریت کے دوران مسلم علاقوں میں قوم پرستی اور علاقائی تعصب کے بیج بوئے گئے تھے اور ان بیجوں سے اُگنے والے درخت دورِ حاضر میں بھی اپنا ثمر دے رہے ہیں۔

امریکی مشنریوں نے عربی زبان سیکھ کر بائبل کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جو لوگ عربی زبان کو پھر سے قوت بخشنا چاہتے تھے۔ ان کو یورپی جامعات میں وظیفہ دیکر تعلیم کے لئے لے جایا گیا۔ پھر جب وہ وہاں سے اپنے علاقوں کو واپس لوٹے تو ان سے عربی ادب پر کتابیں لکھوائی گئیں۔ اور عربی

زبان کو نئی جہت اور توانائی دی گئی۔ اس سے عربی ثقافت کو غیر ضروری اہمیت مل گئی جس سے عربوں کا ایک نیا تشخص سامنے آیا اور اس تشخص نے ان کے مذہبی تشخص اور ان کی دولت عثمانیہ سے وفاداری کو معدوم کیا۔[11] اور اسلامی وحدت عرب قومیت اور ترک قومیت میں بٹ گئی۔ ملی مفادات پر قومی مفادات نے غلبہ حاصل کیا۔

مسجدِ اقصیٰ کا مسئلہ جو کبھی امت مسلمہ کا مسئلہ تھا رفتہ رفتہ عرب قوم کا مسئلہ بن گیا۔ بعد میں اس کو مزید محدود کر کے فلسطین کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ مصر جو کہ اسلامی تہذیب کا تابناک باب ہے قوم پرستی کے اثر کے تحت اپنے آپ کو تاریخی لحاظ سے فراعنہ کی تاریخ کے ساتھ جوڑنے لگا۔ مصر صرف مصر ہے نہ کہ اسلامی تہذیب کا ایک جاندار جز۔ اسی طرح ترکی اپنی جڑ کو یورپی تہذیب میں ڈھونڈنے لگی اور اپنے شاندار عثمانی ماضی کو ختم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ یورپین یونین میں جگہ بنانا اس کے لئے وقار کا مسئلہ بن چکا ہے۔

پاکستان جو کہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا سخت علاقائی عصبیت کا شکار ہے اور بتدریج علاقائی عصبیت اس کے اندرونی استحکام کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ بنگلہ دیش کا پاکستان سے الگ ہونا اس عصبیت کی ایک نشانی ہے اسی طرح دوسرے صوبوں میں اس عصبیت کو مزید ہوا دی جا رہی ہے جو پاکستان کی سالمیت اور وجود کیلئے خطرہ ہے۔

اسی طرح کشمیر (ہند) میں بھی کشمیریت کے نام پر قوم پرستی کی تحریک چلائی جا رہی ہے تا کہ کشمیر صرف کشمیریوں کا رہے اور یہاں آباد مسلمان دوسری دنیا کے مسلمانوں سے الگ ہو کر اپنے آپ کو بھارتی تہذیب (ہندو تہذیب) کا ایک حصہ مان لیں اور اپنا تشخص کشمیر کے ہندو ماضی سے جوڑیں۔

غیر مذہبیت (Secularism)

غیر مذہبیت ایک ایسی تحریک ہے جس نے خلافت عثمانیہ کے اختتام کے بعد اسلامی دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع کیا۔ سیکولرازم سے مراد مذہب کو چند رسوم تک

محدود کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں مذہبی قوانین انسانی قوانین سے بدل دئے جاتے ہیں اور انفرادی زندگی میں مذہب صرف اسی حد تک نافذ رہتا ہے جس سے مذہب انسانی معاشرتی نظام میں کلیدی کردار ادا نہ کر سکے۔ اس طرح اس غیر مذہبی معاشرہ کی ثقافت اور اس کی تہذیب غیر مذہبی بن جاتی ہے اور اس غیر مذہبی تہذیب میں مذہب دوسرے غیر ضروری اجزاء کی طرح اس تہذیب کا ایک جز بن کے رہ جاتا ہے۔ جس کی تبدیلی اس ثقافت یا تہذیب میں خاص بدلاؤ نہیں لا سکتی۔

مسلم ممالک میں سیاسی طور پر جس مغربی نظریہ نے اندرونی انتشار برپا کیا وہ نظریۂ سیکولرازم ہے، جس سے مسلمانوں میں فکری ارتداد کو ہوا لگی۔ مصطفٰے کمال اتاترک (۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) اسلامی دنیا میں پہلا سیاست دان ہے جس نے اسلامی دنیا کو اسلامی ماضی سے الگ کر کے مغربی سیکولر خطوط پر ڈالنے کی کوشش کی۔ ترکی میں اس کی تحریک کامیاب ہوئی اور ترکی جو ایک لمبے عرصہ تک اسلامی دنیا کی قیادت کرتی رہی وہ سیکولرازم کا شکار ہو کر اسلامی تہذیب میں ایک سیاہ باب بن کے رہ گئی۔

جہاں تک کمالیت کا تعلق ہے سیکولرازم کمالیت کے چھ بنیادی عناصر میں سے ایک خاص عنصر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں سلطنت عثمانیہ کا اختتام اصل میں اسلامی دنیا میں سیکولر تحریکات کی ابتداء ہے۔ مغربی دنیا ہمیشہ اسلامی ممالک میں دو گروہوں کا تذکرہ کرتی رہتی ہے۔ ایک اسلامی گروہ جس کو وہ اکثریت کا نام دیتے ہیں اور دوسرا غیر اسلامی گروہ جو ان کے نزدیک اس ملک کی اقلیت شمار ہوتی ہے۔ آگے چل کر وہ اسلامی گروہ کو مزید بنیاد پرست، انتہا پسند، اعتدال پسند، رجعت پسند وغیرہ ناموں کے تحت تقسیم کرتے ہیں۔

پھر مغربی ممالک کسی بھی مسئلہ کو ہوا دیکر اکثریت اور اقلیت کے درمیان تصادم کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح عثمانی حکومت کے دوران یورپی ممالک نے اسلامی سلطنت میں آباد یہودیوں کو اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اگر دو مذہبوں کے پیروکار ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار نہ

ہوئے تو اس ملک میں آباد مختلف مکتبہ فکر سے وابستہ گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ جیسا کہ عراق میں شیعہ سنی اتحاد توڑنے کے لئے مغربی میڈیا نے دوسری عراق جنگ کے دوران شیعہ اسلام اور سنی اسلام کی اصطلاحات کا بے تحاشہ استعمال کیا۔ جب کسی ملک میں مذہبی یا مسلکی فساد اُبھرنے لگتا ہے تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس ملک کا عوام ایک ہی مذہبی قانون قبول نہیں کر سکتا اور ایک ہی ملک میں الگ الگ مذہب کے پیروکاروں کے لئے الگ الگ اور مکمل مذہبی قانون نافذ کرنا عملاً ناممکن ہے، یا ایک ہی ملک میں رہنے والے ایک ہی مذہب سے وابستہ مگر مختلف مکتبہ خیال کے پیروکار بھی ایک ہی مکتبہ خیال کی ترجمانی کرنے والے مذہبی قانون کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے اس لئے تھک کر اس ملک کے مذہبی رہنما آخر کار اس ملک کو سیکولر کرنے پر مجبور کرائے جاتے ہیں۔ پاکستان کی بنیاد اگرچہ اسلامی نقطہ نگاہ سے کلمہ طیبہ پر پڑی تھی مگر اندرونی مسلکی اور دوسرے انتشاروں کے چلتے پاکستان آج تک ایک مثالی اسلامی ملک نہ بن سکا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی ملک سیاسی طور پر سیکولر ہو جاتا ہے تو اس ملک میں پھر بآسانی کوئی بھی مذہبی مبلغ یا تبلیغی تنظیم داخل ہو کر اپنے مذہب کا پرچار کر سکتی ہے۔ دوسرے مذاہب یا غیر مذہبی کتابوں اور کیسٹوں کو بآسانی پھیلایا جا سکتا ہے۔ کسی ملک کا سیکولر ہونا مغربی مفادات کے حصول کو زیادہ آسان بنا سکتا ہے۔ اس ملک میں آرام سے مسیحی مشینری اسکول، مسیحی تحقیقی ادارہ جات اور دیگر مسیحی اکائیاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ اور اس ملک کی سیکولر ذہنیت ان کو تحفظ بھی فراہم کر سکتی ہے۔ پاکستان اگرچہ سیکولر ملک نہیں ہے مگر عملاً غیر اسلامی اور اسلامی قوانین کا ملغوبہ نافذ ہونے کی وجہ سے اس ملک میں عیسائی مذہب بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ یہی حال بھارت کا بھی ہے اور بنگلہ دیش بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

سیکولرائزیشن کی چند تحریکات یہ ہیں:

۱۔ سیکولرائزیشن بذریعہ روایت شکنی

۲۔ سیکولرائزیشن بذریعہ عقلانیت
۳۔ سیکولرائزیشن بذریعہ نظریت
۴۔ سیکولرائزیشن بذریعہ تجارت
۵۔ سیکولرائزیشن بذریعہ جنسیت
۶۔ سیکولرائزیشن بذریعہ استہلاکیت
۷۔ سیکولرائزیشن بذریعہ فحاشیت
۸۔ سیکولرائزیشن بذریعہ انتظامی مقامات وقواعد
۹۔ سیکولرائزیشن بذریعہ تعلیم گاہ
۱۰۔ سیکولرائزیشن بذریعہ معاشرتی ادارہ[۱۲]

جمہوریت (Democracy)

اسلامی تہذیب بذات خود جمہوریت کی حمایت کرتی ہے۔ جمہوری نظام اسلام کی بنیادی مانگ ہے مگر امریکی اور فرانسیسی انقلابات کے بعد دنیا میں جدید مغربی جمہوریت نے اپنے قدم مضبوط کیے۔ دورِ حاضر میں مغربی تہذیب اس تگ ودو میں مصروف ہے کہ کسی طرح مسلم ممالک میں قائم سیاسی نظام کو بدل کر وہاں مغربی جمہوری نظام قائم کیا جائے تاکہ ان کے ادارہ جات کو پوری طرح مغربی اثر میں لایا جاسکے۔ اس طرح وہ دنیا کے تہذیبی نقشہ سے اسلامی ادارہ جات کو بالعموم اور اسلامی تہذیب کو بالخصوص معدوم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اظہر من الشمس حقیقت ہے کہ اگر کوئی مسلم ملک بآسانی مغرب کے اغراض و مقاصد اور اس کے مفادات کے حق میں اپنی سیاسی اور دیگر پالسیاں تیار کرتا ہے اور اپنے عوام کی امنگوں اور جذبات کو کچل کر رکھتا ہے تو مغربی اس ملک سے راضی رہ کر اس ملک کے سیاست دانوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں تاکہ ان کے سیاسی حکمران ملک کا نظام اپنے

ہاتھ میں رکھ کر مغرب کے مفادات کی برپائی کرتے رہے اور اگر کہیں اس ملک میں جمہوری نظام ہونے کے باوجود اس ملک کے حکمران اپنی پالیسیوں میں مغربی مفادات پر توجہ نہ دیتے ہوں اور صرف اپنے عوام اور اسلامی تہذیب کے مفادات اور اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہوں تو اس سیاسی حکومت کو ''غیر جمہوری'' اور ''ظالم حکومت'' کا نام دیکر ختم کیا جاتا ہے اور جمہوریت کے نام پر اس حکمران کی جگہ اپنے حق میں بولنے والے شخص کو لایا جاتا ہے۔

الجزائر (Algeria) میں ۱۹۹۲ء میں اس لئے جمہوری انتخابات کو کالعدم کروایا گیا کیونکہ ان انتخابات کے چلتے وہاں اسلامی تہذیب کے حق میں کام کرنے والی سیاسی تنظیم Islamic Salvation Front برسر اقتدار آسکتی تھی جبکہ پاکستان میں قائم غیر جمہوری حکومت کو اس لئے قائم رکھا گیا ہے کیونکہ پرویز مشرف پوری طرح مغرب کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے اگرچہ اس کا عوام اس سے خوش نہیں ہے۔

اگر کوئی ملک مغرب کے مقاصد کے حصول میں روڑا اٹکانے کی کوشش کرتا ہے تو مغربی ممالک اولاً اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس حکومت کے نقائص کی ترویج و اشاعت بڑے زور و شور سے کرتے ہیں۔ اس حکومت کے خلاف پروپگنڈا کرنا اور اس کو بدنام کرنا ان کے میڈیا کی ترجیحات میں شامل رہتا ہے تاکہ اس حکومت کے خلاف اس کے ہی ملک میں بدنامی اور انتشار برپا ہو۔ اس کے بعد اگر وہ حکومت ہار مان کر مغربی مقاصد اور مفادات کے حق میں اپنی رائے منتقل کرتی ہے تو اس حکومت کو جائز اور صحیح سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ اس وقت لیبیا کے صدر کرنل قذافی کی حکومت کو مغرب قبول کر رہی ہے جبکہ اسی صدر کو امریکہ کے ایک صدر نے ''پاگل کتا'' کہا تھا۔ یہی رویہ پاکستان کی موجودہ غیر جمہوری حکومت۔ جس کی قیادت صدر جرنل پرویز مشرف کر رہا ہے۔ کے ساتھ جاری ہے۔ ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جب پرویز مشرف نے فوجی بغاوت کے نتیجہ میں نواز شریف کی ''جمہوری'' حکومت کو برطرف کیا تھا تو مغرب نے اس قدم کی سخت مخالفت کی تھی۔ پاکستان کی دولت

مشترکہ (Common Wealth) ممبرشپ معطل کی گئی۔ یہ برطانیہ اور کینیڈا کا ایک ایسا حربہ تھا جس کے ذریعہ وہ پاکستان کو جمہوری حکومت بحال کرنے کے لئے مجبور کررہے تھے مگر جب ۲۰۰۱ء میں افغانستان کے خلاف امریکی محاذ میں پاکستانی صدر پرویز مشرف نے امریکہ و دیگر اتحادیوں کی بھرپور مدد کی تو اس حکومت کو جائز قرار دے کر پاکستان کے خلاف کئی اقتصادی پابندیاں نرم کی گئی۔ اس طرح کے مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں مغربی جمہوریت کا نعرہ صرف مغربی مفادات کی بقا کے لئے ہے۔ اسی تناظر میں ہمیں عرب کی مختلف خاندانی حکومتوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ سب حکومتیں اس لئے غیر جمہوری ہونے کے باوجود قائم ہیں کیونکہ یہ سب حکومتیں امریکی مفادات کو پورا کررہی ہیں۔

یہ بھی قابل غور حقیقت ہے کہ اب اگر مسلم ممالک کی کوئی حکومت مغربی مفادات کے سلسلے میں اپنے عدم تعاون کے رویہ میں لچک نہیں لاتی ہے تو اس حکومت کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کی جگہ اس کی قوم میں سے کوئی ایسا فرد چنا جائے جو اپنی تاج پوشی کو مغرب کی دین سمجھ کر ہر وقت ان کے مفادات، اغراض و مقاصد کے حصول میں معاون ثابت ہو خواہ اس کو اپنے ملک کے مفادات کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچانا پڑے۔ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مغرب اس حکومت کو غیر جمہوری اور غیر اخلاقی، ظالم، دہشت گرد اور غیر انسانی نام دیکر اس کو بدلنے کی کھلم کھلا کوشش کرتا ہے۔ اور جمہوریت کے ظاہری حسین لباس میں اپنی کٹھ پتلی سرکار کو حکومت تفویض فرماتا ہے۔ اس کی مثال افغانستان میں موجود حامد کرزائی کی حکومت ہے۔

پچھلی کچھ صدیوں سے مغرب ایک منظم سازش کررہا ہے کہ کسی طرح غیر مغربی ممالک میں اپنی تہذیبی حمایت کو مضبوط کیا جائے۔ اس کے لئے وہ اپنی جامعات اور تحقیقی اداروں میں غیر مغربی ممالک کے ذہین دانشوروں، سیاست دانوں اور دیگر شعبہ جات سے وابستہ افراد کو پڑھنے کا موقع دیتا ہے جو بتدریج اس کی تہذیبی آب و ہوا میں یا تو اس نئی تہذیب سے مرعوب ہو جاتے ہیں یا پوری طرح اپنے ذہن کو مغربی سوچ میں گرفتار کرتے

ہیں۔اس طرح ان کے سوچنے کے زاویوں میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ان کے مشرقی جسم مغربی دماغ کے قابو میں آجاتے ہیں جو عموماً سیکولر اور لامذہب ہوتے ہیں۔

جب کسی مسلم ملک میں مغرب کو اپنی گرفت مضبوط کرنی ہوتی ہے تو ان مغرب میں پڑھے لکھے افراد کو ان ممالک کے کلیدی عہدوں - بالخصوص سیاسی عہدوں - پر جمہوریت کے نام پر فائز کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک میں ایسے حکمران نظر آتے ہیں جو مغربی جامعات سے فارغ شدہ ہیں۔ اسی لئے مسلم ممالک کے کئی حکمران اپنے عوام سے زیادہ مغربی عوام میں مشہور ہیں۔ چونکہ مغرب کے پاس اس وقت طاقت ہے اس لئے وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے جمہوریت کے نام پر اپنے لئے غلام تلاش کرتے ہیں تاکہ نو استعماریت (Neo-Colonialism) سے مشرقی ممالک کو اپنے تسلط میں رکھا جائے اور دنیا اس کے خلاف بھی نہ بول سکے۔

تعلیم (Education)

تعلیم ایک ایسا آلہ ہے جس سے بآسانی کسی بھی قوم کے اذہان کو بدلا جا سکتا ہے۔ تعلیم سے ہی انسان کی ذہنی نشوونما ہوتی ہے اور وہ فکری لحاظ سے بالغ ہو جاتا ہے۔ کسی بھی قوم کے سوچنے، سمجھنے اور کسی خاص عمل کے ردعمل کا تعلق اس قوم کی فکری ساخت اور آئیڈیولوجی پر ہوتی ہے اور یہ تمام عناصر تعلیم سے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ ہر ایک قوم دو طبقات میں منقسم کی جا سکتی ہے۔

۱۔ خاص طبقہ

۲۔ عام طبقہ

خاص طبقہ عمومی طور پر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور یہی طبقہ کسی بھی قوم کے سیاسی، تعلیمی، اقتصادی، زرعی، فوجی، ثقافتی، مذہبی ادارہ جات کی نہج متعین کرتا ہے۔ اگر اس خاص طبقہ میں کوئی فکری یا ذہنی بدلاؤ واقع ہو تو اس کا اثر براہِ راست اس قوم کے

ادارہ جات پر پڑتا ہے۔

مسلم ممالک میں کئی دفعہ یہ امر دیکھنے کو ملا ہے کہ جب خاص طبقہ مغربیت کا نقیب بن کر مغربیت کا اثر اپنے اداروں پر ڈالنے لگا تو عام طبقہ اس فکر کو رد کر کے بغاوت پر اتر آیا اور نتیجتاً ان کو حسبِ دستور طاقت کے بل پر خاموش کیا گیا۔ چونکہ موجودہ دور میں اکثر مسلم ممالک کا خاص طبقہ مغربی تعلیم سے مستفید ہو کر اپنے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح عوام کو اپنی فکری خطوط پر ڈالا جائے اور اس کے لئے وہ تعلیم کا آلہ استعمال کرتے ہیں۔ مدارس و کالج میں وہی کچھ پڑھایا جاتا ہے جو ان کی فکر کے موافق ہو اور نصاب سے ان موضوعات کو دور رکھا جاتا جو موضوعات ان کے نظریہ یا حکومت میں رخنہ ڈال سکتے ہیں۔

مغرب کی مسلسل کوشش رہتی ہے کہ کسی طرح مسلم ممالک کے تعلیمی نظام میں دخل اندازی کی جائے تاکہ وہاں پر مغربی تہذیب کے موافق حالات پیدا ہوں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد مغرب مسلسل اس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے کہ اسلامی مدارس میں خصوصی طور پر تبدیلی لائی جائے۔ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ کسی طرح اسلامی مدارس میں وہ اسلام پڑھایا جائے جس میں مغربی ادارہ جات سے تعارض موجود نہ ہو۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان اور جرمنی پر پابندی لگائی گئی تھی اور ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ کسی طرح اپنے دستورِ تعلیم اور ثقافت کو تبدیل کریں کیونکہ وہ امریکہ اور اس کے حلیفوں کے دشمن تھے۔[۱۳] امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مسلم ممالک کے اسکولوں، دینی مدارس، کالجوں اور جامعات میں رائج نظامِ تعلیم میں وہ اقدار داخل ہوں جو اقدار مغربی تہذیب کی اساس ہیں یا جو اقدار آگے چل کر مشرقی ممالک میں مغربی اثر کی مخالفت کو تقریباً ختم کر دیں۔

عجیب معاملہ یہ ہے کہ مغرب اس بدلاؤ کے مطالبہ کی وجہ یہ بتا رہا ہے کہ اسلامی ممالک کے تعلیمی نصاب میں ''تشدد اور انتہا پسندی'' پر مبنی اجزاء داخل ہیں۔ مگر اسرائیل کے

تعلیمی نظام میں تورات اور تلمود داخل ہیں۔[14] اور یہ دونوں کتابیں پُر تشدد تعلیمات سے بھری پڑی ہیں، مگر ان سے اس قسم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے۔ آخر اس دہرے معیار کی وجہ کیا ہے؟

اسلامی ممالک کے اکثر سیاست دان مغربی جامعات سے مستفید ہوئے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں استعماریت کا دور دورہ تھا اور مسلم ممالک کے ذہین طالب علموں کو مختلف مغربی یونیورسٹیوں اور اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے لے جایا گیا تاکہ وہ اپنی تہذیب کو مغربی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور اس سے بدظن ہو کر اپنے مغربی ذہن کے مطابق اس میں اصلاح کے نام پر تجدد کی تحریک برپا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ استعماریت کے دوران لکھا ہوا عربی ادبی مواد مغربی ذہن کی عکاسی کر رہا ہے۔

بھارت نے بھی۔ بی جے پی حکومت آنے کے بعد۔ کھلم کھلا تعلیم کا استعمال کر کے یہاں کی ملی جلی تہذیب کو پوری طرح ہندو تہذیب میں بدلنے کی تحریک شروع کی ہے۔ تاریخ کو پھر سے دوبارہ لکھنا شروع کیا گیا اور تعلیمی اقدار کو ہندو اقدار کے مشابہ بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے عیسائی مشنری اسکولوں نے بھی استعماریت کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی مشرقی علاقہ جات کو مغربی بنانے کی سعی کی ہے۔ انیسویں صدی کے دوران مشنریوں نے بحیثیت آلہ کار کسی نہ کسی استعماری قوت کے لئے کام کیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یورپی نوآبادکاروں نے جدید تعلیمی، تکنیکی تبدیلیاں متعارف کیں اور اگرچہ یہ تبدیلیاں استعماریت کے بعد بھی جاری رہیں مگر انہوں نے علاقائی آبادی پر منفی اثر بھی ثبت کئے۔[15] مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس مغربی تعلیم کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ”یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (Genocide) کے مترادف تھا، عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جابجا مراکز قائم کئے ہیں جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا“۔[16]

آپ کوتر کی سے لیکر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظامِ تعلیم کے پیداوار ہیں ان میں سے جن کو براہِ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا انہوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظامِ تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا۔ ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے"۔ [۱۷]

نیا عالمی نظام (New World Order)

نیا عالمی نظام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر ایک کے ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نیا عالمی نظام ایک ایسا نظام ہے جس کی لگام امریکہ (قائد مغرب) کے ہاتھ میں ہوگی اور جس کے شکار کمزور اور غریب مشرقی ممالک ہوں گے۔ اس نئے نظام کے مختلف حربے اور آلات ہیں جن میں سے کچھ یوں ہیں:

۱۔ مجلس اقوام متحدہ

۲۔ گلوبلائزیشن (عالم کاری)

۳۔ عالمی تہذیب

"۔۔۔ان تمام طریقوں سے ہم [یہودی] غیر یہود اتنا زچ کر دیں گے کہ وہ ہمیں بین الاقوامی اقتدار پیش کر دیں گے اور باہمی اختلافات میں ہمیں ثالث بنانے لگیں گے، اس طرح ایک سپر گورنمنٹ معرضِ وجود میں آجائے گی۔ آج کے حکمرانوں کی جگہ ہم ایک ایسے ادارے کی تشکیل کریں گے جو اعلیٰ نظام (Super Government) کہلائے گی۔ اس ادارے کے ہاتھ چاروں سمت پہنچیں گے اور اس کا دخل دنیا کے ہر گوشے میں ہوگا۔ اس کی نظامت کے ایک ہزار پہلو ہوں گے اور یہ اقوام عالم کو زیرِ نگیں لانے میں کبھی ناکام نہیں ہوگی"۔ [۱۸]

مندرجہ بالا اقتباس یہودی پروٹوکولز سے لیا گیا ہے۔اس اقتباس میں اعلیٰ نظامت (Super Government) کی بات کہی گئی ہے۔ جو Henry Klein- جوکہ ایک یہودی وکیل تھا- کے مطابق مجلس اقوام متحدہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔[19] ۱۹۴۶ء میں مجلس اقوام متحدہ کا وجود عمل میں لایا گیا۔اس نے اصل میں لیگ آف نیشنز- جوکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد بنائی گئی تھی- کی جگہ لی۔اسی لیگ آف نیشنز کی بنیاد پر اقوام متحدہ کی بناء پڑی۔اور اسی مجلس اقوام متحدہ نے یہودی ریاست اسرائیل کے وجود کو ممکن بنایا۔

> ''ہم [یہودی] اپنی قوت کا مظاہرہ کسی خاص ملک پر تشدد کر کے یا دہشت پھیلا کر کریں گے جس سے دوسری مملکتوں کو عبرت حاصل ہوگی۔اگر ہم نے اپنے خلاف کسی عام بیداری اور تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا تو اس کا جواب ہم امریکہ، چین یا جاپان کی بندوقوں اور توپوں سے دیں گے''۔[20]

دوسرے اقتباس سے دو چیزیں واضح ہو رہی ہیں۔اول یہ کہ یہودی کسی خاص ملک پر اپنی دہشت کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا عملی ثبوت فلسطین ہے اور اپنے دشمن کے خلاف یہودی امریکہ، چین یا جاپان کی بندوقوں اور توپوں کا استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں یہودیوں نے امریکہ کو پوری طرح اپنے ساتھ ملا لیا اور اس سے اپنے منصوبہ کے مطابق کام لیا۔جس کی دلیل موجودہ دنیا میں امریکی ہتھیاروں اور افواج کا اسرائیل کی امداد کرنا ہے۔اصل میں امریکی یہودیوں نے بہت پہلے سے امریکی سیاست کو اپنے اثر میں لایا ہے۔[21] جس کے چلتے وہ اسرائیلی مفادات کو امریکہ کے ذریعہ تحفظ عطا کرتے ہیں۔نوام چومسکی کے مطابق سرد جنگ کے دوران امریکی پالسی کے تین اہم اجزاء مشرق وسطیٰ سے متعلق تھے جن میں ''اسرائیل کا تحفظ'' بھی بحیثیت ایک جز شامل تھا۔[22]

اقوام متحدہ نے ہمیشہ یہودی اور امریکی مفادات کی پاسداری کی ہے اور ہر وقت یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح ان ممالک کا قلع قمع کیا جائے جو ممالک مغرب یا اسرائیل کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔مغرب نے ہمیشہ اس ادارہ کا استعمال کر کے پورے عالم اسلام کو

اپنے ماتحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ مغرب کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب نہ صرف آفاقی (Universal) ہے بلکہ یہ ایک منفرد تہذیب بھی ہے۔ اس لئے امریکہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی صفات اور اقدار کو تحفظ اور حفاظت دینے کے ساتھ ساتھ اس کو نئی جلا بھی بخشے۔[۲۳] ان اقدار کو تحفظ بخشنے اور یہودی مفادات کو پورا کرنے کے لئے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام نے دنیا کے تمام ممالک کو ایک ایسے ادارہ کے ماتحت کیا جو ادارہ امریکہ اور اسرائیل کے ہاتھوں میں مفلوج ہے۔ بالفاظ دیگر تمام دنیا کے ممالک اس ادارہ سے وابستہ ہونے کے نتیجہ میں امریکہ اور اسرائیل کے غلام بنتے گئے۔

چونکہ امریکہ مغرب کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو وقف مانتا ہے اور مغربی تہذیب اس کے یہاں آفاقی تہذیب ہے اس لئے پوری دنیا کو مغربی رنگ میں رنگنے کے لئے پہلی خلیجی جنگ کے بعد باضابطہ طور پر گلوبلائزیشن (عالم کاری) کا اعلان کیا گیا۔ گلوبلائزیشن کے حقیقی معنی نجی سرمایہ کاری کا فروغ ہے۔ اس پر عاید ہر قدغن کو دور کرنا ہے۔[۲۴] اس سے تمام ممالک کی حکومتیں محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کرتی گئی اور حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے نکل کر نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں چلی گئی جو مغربی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں یہ نہج عالمی سرمایہ داری (Global Captalism) کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ چونکہ گلوبلائزیشن دنیا کو سیکولر اور مادی نقطہ نگاہ سے دیکھتی ہے اس لئے اس نئے عالمی نظام کا حصہ بننا گویا سیکولرازم اور مادیت کو بطور ''معبود'' تسلیم کرنا ہے۔ اس لئے اس مغربی رنگ میں مشرقی دنیا کو رنگنا مشرق کے لئے قبول کرنا بہت ہی مشکل ہے جس سے ایک کشمکش اور ''تصادم'' کو جنم ملتا ہے۔

''اگر ہمارا [یہودیوں کا] حریف یعنی حکومت، سیاسی آزادیوں کے تصور سے سرشار ہو اور نام نہاد لبرل ازم کی حامی ہو اس کو گرانا اور بھی زیادہ آسان ہو جاتا ہے''۔[۲۵]

''جب ہم نے مملکتوں کے نظام پر لبرل ازم کا زہر بھرا تو ان کا تمام سیاسی رنگ تبدیل ہو گیا''۔[۲۶]

مندرجہ بالا اقتباسات یہودی پروٹوکولز سے لئے گئے ہیں۔ان پروٹوکولز کا مدعا کسی بھی طرح گریٹر اسرائیل کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا ہے۔اس لئے یہ ہدایات ایک بہت بڑے مقصد کے لئے دئے جارہے ہیں۔درج بالا اقتباسات میں سیاسی لبرل ازم کا تذکرہ ہورہا ہے مگر لبرل ازم محض سیاسی شعبہ تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اقتصادی شعبہ بھی اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔تیسری دنیا کی معیشت کی لبرلائزیشن گلوبلائزیشن کے لئے بنیادی ضرورت تصور کی جاتی ہے۔چونکہ اس لئے ترقی پذیر ممالک پر ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ایک سخت دباؤ ڈالا جاتا ہے۔عالمی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund) اور عالمی بینک کی طرف سے غریب اور مشرقی ممالک کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی معیشت کو لبرلائز (Liberalise) کریں۔چونکہ ترقی پذیر ممالک پہلے ہی ان اداروں کے قرضہ جات کے نیچے دبے ہوتے ہیں اسلئے یہ ممالک ان اداروں کی طلب کو پورا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے نام پر کئی بین الاقوامی کمپنیاں مشرقی ممالک میں مقامی کمپنیوں سے مقابلہ کرتی ہے۔چونکہ مقامی کمپنیاں ہر ایک لحاظ سے ان بین الاقوامی کمپنیوں کا مقابلہ کرنے کے لائق نہیں ہوتی،اس لئے یہ مقامی کمپنیاں یا تو زوال کی شکار ہوتی ہیں یا پھر یہ مقامی کمپنیاں اپنے آپ کو ان بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے ہاتھ میں دیتی ہے اور انکے ساتھ تعاون یا اشتراکیت (Collaboration) کے نام پر آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے۔اس سے پورا ملکی سرمایہ مغربی ممالک میں چلا جاتا ہے اور مغربی ممالک۔جن سے بین الاقوامی کمپنیاں تعلق رکھتی ہیں۔کی خارجہ پالیسی بآسانی مشرقی ممالک کے سیاسی مستقبل کو بنا اور بگاڑ پاتی ہے۔اس طرح مشرقی ممالک اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر بین الاقوامی کمپنیوں کے اصل مالکوں کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں جو کہ نو آبادکاری (Colonialism) کی جدید صورت ہے۔

چونکہ گلوبلائزیشن سے مغربی ممالک دن بدن مشرقی دولت سے امیر بنتے جارہے

ہیں جبکہ مشرقی ممالک اپنے ملکوں سے سرمایہ چلے جانے کے سبب دن بدن غریب ہوتے جارہے ہیں۔اس سے مشرقی ممالک میں آبادرعایا میں ایک شدید قسم کے غصہ نے جگہ لی ہے جو کبھی کبھی مغرب پر بطور ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ سعودی عرب میں ہورہے مغربیوں پر حملوں کی وجہ وہاں پر موجود بین الاقوامی کمپنیوں کا سعودی قدرتی ذخائر سے پٹرول حاصل کرنا ہے جبکہ سعودیہ خود دن بدن اقتصادی طور پر کمزور ہورہا ہے اور اسکے قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی دولت کی وجہ سے مغرب دن بدن امیر بن رہا ہے۔ ۱۱ستمبر کے واقعات کے بعد امریکہ کے صدر نے پوری دنیا کو متنبہ کیا کہ یا تو وہ امریکہ کا ساتھ دیں یا حملے کے لئے تیار رہیں۔ یہ زبان امریکہ کے ذہن میں پیوست مغربی تہذیب کی آفاقیت کے خیال کو ظاہر کررہا تھا۔اس طرح امریکہ اپنے آپ کو پوری دنیا کا ترجمان ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہے اور ایک ''عالمی آمریت'' قائم کرنے کا احساس بھی کرارہا ہے۔ جس سے نہ صرف ''تصادم'' کا خطرہ ہے بلکہ ایک مسلسل جنگ کا بھی امکان ہے۔اسی عالمی آمریت کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ پاکستان، سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک کو دن بدن اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور کررہا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کی طرف سے اسرائیل کے خلاف جاری مزاحمت کمزور پڑ جائے۔ مگر محض اسرائیل کو تسلیم کرنے سے یہ مزاحمت کمزور نہیں پڑسکتی جب تک نہ اصلی اور بنیادی وجوہات پر غوروخوص کیا جائے۔

جہاں تک اس گلوبلائزیشن کا تعلق ہے اس نے نہ صرف معاشی اور سیاسی میدانوں کو متاثر کیا ہے بلکہ فن، ادب، ثقافت اور اسلامی تہذیب کو بھی اس نے سبوتاژ کرنے کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ زبان کسی بھی ثقافت یا تہذیب کی ترقی میں اہم کردار رکھتی ہے۔ زبان اپنے ساتھ جن خیالات اور احساسات کو برآمد کرتی ہے وہی احساسات اور خیالات آگے چل کر نئی تہذیب کے عقائد بن سکتے ہیں۔ اگر زبان کو باطل خیالات اور احساسات سے پاک کیا جائے تو ممکن ہے کہ معاشرہ کئی بدعات و کمزوریوں سے پاک ہوسکتا ہے اور اگر زبان کو آلودہ کیا جائے تو اس تہذیب کی شکل وصورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ مصطفٰے کمال

اتاترک نے تو زبان کو بدل کر پوری ترکی کے کلچر کو ہی بدل دیا اسی طرح مسلم خلفاء نے عربی زبان کی حفاظت کا بیڑا اُٹھا کر اسلامی تہذیب کو محفوظ کر دیا۔

گلوبلائزیشن کی وجہ سے زبانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جانے لگی ہے۔ فصیح اور ادبی زبان کے بجائے بازاری (slang) زبان کو فروغ دیا جانے لگا ہے۔ انگریزی کو ہر ایک مشرقی ملک میں ضرورت کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ جس سے قدیم مشرقی تہذیبیں بتدریج کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ مثلاً گُرگاؤں دہلی میں ایک کال سینٹر کالج (Call Centre College) میں سینکڑوں بھارتی نوجوان امریکہ یا برطانوی لہجہ میں انگریزی بولنا سیکھ رہے ہیں تاکہ وہ بین الاقوامی کمپنیوں کے ٹیلی فون کالوں کا جواب دے سکیں۔ ان کے نام بدل دئے جاتے ہیں۔ مثلاً سشما سوسن بن جاتی ہے اور گووند کو جیری بلایا جاتا ہے۔[۲۷] اس طرح ان کی تہذیبی شناخت کو چھپا کر ان کو چند روپیوں کے عوض خرید کر مغربی خدوخال اپنانے پر تیار کیا جاتا ہے۔ جس سے بتدریج مغربی تہذیب مشرق میں اپنے پاؤں جما رہی ہے تاکہ ثقافتی طور پر بھی مشرقی ممالک کو اپنا غلام بنایا جائے اور رفتہ رفتہ پوری دنیا پر مغربی تہذیب بحیثیت "عالمی تہذیب" کے چھا جائے۔

الغرض، اس نئے عالمی نظام کا واحد مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مشرق کو اپنے ماضی اور مذہب سے الگ کر کے اس کو مغربی تہذیب اپنانے کے لئے تیار کیا جائے تاکہ مغرب اپنی بالادستی کو برقرار رکھ سکے اور یہودی اپنے مقاصد کو پوری طرح حاصل کر پائیں۔ اس سے مغربی تہذیب "عالمی تہذیب" میں بدل سکتی ہے مگر مغربی تہذیب بنیادی طور پر کچھ ایسے نقائص کی حامل ہے جس سے اس کا یہ خواب قطعاً پورا نہیں ہو سکتا۔ مریم جمیلہ کے مطابق کسی بھی تہذیب کو آفاقی بننے کے لئے آفاقی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ مگر موجودہ مغربی تہذیب ان اقدار سے واضح طور پر عاری ہے۔ نظریاتی طور پر اس کے پاس برہنہ خودغرضی، غیر ذمہ دارانہ حصول لذت اور خالص اور بغیر ملاوٹ مادہ پرستی کے بغیر دنیا کو دینے کے لئے کچھ اور نہیں ہے۔[۲۸]

حواشی

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عالم عربی کا المیہ، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۸۰ء ص ۲۲۔

2. Nahun Goldmann quoted in *Palestine -Re-Emerging*, by Sheikh Mohammad Iqbal, Kashmir, S.N.A. and Bros. 2002, pp 4(a)-5(a).

3. Dilip Hiro, *War without End*, New Delhi, Rotledge, 2002, p. 261.

4. Dilip Hiro, *War without End*, p. 308.

۵۔ یہ قرارداد ۸ نومبر ۲۰۰۲ کو یو این سلامتی کونسل (۴۶۴۴) میں اختیار (Adopt) کی گئی۔

6. Smeul P. Huntington, *The Clash of Civilization*, p.51.

7. Havelock Ellis et al, *Studies in the Psychology of Sex*, quoted in اسرار عالم، عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال, Delhi, Qazi Publishers and Distributors, 1992, p. 172.

8. "*Universal Declaration of Human Rights*", Article I, 1948.

9. Samuel Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs*, Summer, 1993.

10. Maryam Jameelah, *Islam in Theory and Practice*, Delhi, Taj Company, 1997, p. 173.

11. Bassam Tibi, *Arab Nationalism- A Critical Enquiry*, New York, St. Martin Press, 1991, pp. 100-101.

۱۲۔ اسرار عالم، عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، دہلی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۹۹۶ء ص ۱۷۰-۱۷۴۔

۱۳۔ یوسف القرضاوی، امریکہ کا دینی تعلیم میں تبدیلی کا مطالبہ کیوں؟ مترجم: ابوسعد، دہلی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء ص ۴۔

۱۴۔ ایضاً

15. Edward W. Said, *Culture and Imperialism*, New York, Vintage Books, 1994, p 166.

۱۶۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔

۱۸۔ یہودی پروٹوکولز، مترجم: محمد یحییٰ خان، نئی دہلی، ملی پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۲۷۔

19. *World Conqeust Through World Government*, Tr. Victor E. Marsden N.Delhi, Milli Publications, 2003, p. 9.

۲۰۔ یہودی پروٹوکولز، ص ۱۳۱۔

21. Henry Ford, *The International Jew*, Karachi Pakistan, Umma Publishing House, 1970, pp. 128-138.

22. Noam Chomsky, *World Orders, Old and New*, N. Delhi, Oxford University Press, 2003, pp. 221-222.

23. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, p. 311.

۲۴۔ ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی، گلوبلائزیشن اور اس کے معاشی وثقافتی اثرات، نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص ۱۱۔

۲۵۔ یہودی پروٹوکولز، ص ۱۰۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

27. Arundhati Roy, "Power Politics", *Outlook*, Nov. 27, 2000, p. 64.

28. Maryam Jameelah, *Islam and Western Society, N. Delhi, Adam Publishers and Distributors, 1982, p. 78.*

باب چہارم

مغربی تہذیب کے خلاف مشرق کی جوابی تحریکات

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اقوام وتہذیبیں فرد کی طرح ہر ایک عمل کے جواب میں اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہیں۔ یہی ردّعمل اقوام وتہذیبوں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ردعمل کبھی اعتدال پر اور کبھی افراط وتفریط پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرتی دستور ہے کہ ردّعمل آگے چل کر اقوام وتہذیبوں کی نہج اور عمل بن جاتا ہے۔ ردّعمل کی یہ تحریکات یا تو ایک فرد کی تحریک ہوتی ہے یا پھر ایک تنظیم یا جماعت کی سعی پیہم۔

مغرب کی استعماریت اور نوآبادکاری کی جدید صورت اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتداء میں نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے جزیرہ نما عرب کے موحدین جن کو عمومی طور پر "وہابی" کہا جاتا ہے، نے یورپی پھیلاؤ کے خطرات اور مسلم دنیا کے متعلق اس کے ضرر رساں عزائم کو محسوس کیا۔[1] مگر یہ تحریک مسلم معاشرہ میں مذہبی احیاء کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے عثمانیوں- جو کہ اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے حکمران تھے- کو دین سے انحراف اور سیاسی واقتصادی زوال کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے خلاف جنگ شروع کی۔ ان کے بعد لیبیا میں سنوسی اور سوڈان میں مہدی تحریکات ظاہر ہوئیں جو یورپی استعماریت کے خلاف بہادری کے ساتھ لڑے۔ مگر یہ تمام ابتدائی تحریکات یورپی استعماریت کے پھیلاؤ اور بڑھتے سیلاب کو روکنے میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں۔[2]

اس طرح مختلف تحریکات اسلامی دنیا کے دفاع اور مغربی استعماریت کے خلاف برپا ہوئیں۔ کچھ تحریکات ایک فرد کے نظریہ پر قائم تھیں جبکہ بعض تحریکات تنظیم وجماعت

سے منسلک تھیں۔ جن میں سید احمد شہید، ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، حسن البناء، سید قطب، ضیاء گوک الپ، مصطفٰے کمال اتاترک، رشید رضا، بدیع الزماں سید نورسی، سرسید احمد خان، علامہ اقبال، مولانا مودودی، امام خمینی، ملا عمر، اسامہ بن لادن، جیسی شخصیات قابل ذکر ہیں۔ ان تحریکات یا شخصیات کے ردعمل کو عمومی طور پر تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) تحریک کمالیت (۲) تحریک استرداد (۳) تحریک اصلاح۔

تحریکِ کمالیت (Kemalism)

بیسویں صدی کی ابتداء میں جب عثمانی سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور خلافت کا ادارہ کمزور ہونے لگا تو ان پریشان کن اور انتشار سے لبریز حالات میں ترکی کی زمامِ کار ایک مشہور فوجی اور سیکولر انسان مصطفٰے کمال پاشا اتاترک (متوفی ۱۹۳۸ء) کے ہاتھ میں آئی۔ جس نے پوری اُمت مسلمہ کی سیاسی اور معاشرتی پہچان کو بدل ڈالا۔ اگرچہ اس بدلاؤ کے پیچھے ۱۸۷۵ء/۱۸۷۶ء میں جنمے ضیاء گوک الپ جیسے فکری اور ذہنی قوتیں بھی کارفرما تھیں جنہوں نے ترکی کو اپنے مسلم ماضی سے علیحدہ کر کے خالص قومی اور مادی بنیادوں پر اس کی نئے سرے سے تشکیل کی دعوت دی۔ اس ذہنیت اور عمل نے اسلامی دنیا میں شکست خوردگی، مکمل خود سپردگی، مغرب کا عقیدت مند اور سرگرم مقلد بننے کے نظریہ کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ ضیاء گوک الپ نے مصطفٰے کمال۔ جس نے یونانیوں پر فتح حاصل کی تھی۔ کی کھل کر حمایت کی اور علی الاعلان لوگوں کو مغربی تہذیب اپنانے کی دعوت دی۔ اس کے مقالات سے صاف ظاہر ہے کہ ضیاء گوک الپ تہذیب و مذہب کو جدا جدا سمجھتا تھا۔ وہ مذہب کو چند مراسم و عقائد کا ملغوبہ اور تہذیب کو کسی خاص قوم کے علوم، صنعت، فنون وغیرہ شمار کرتا تھا۔[۳] اس کے یہاں ترقی کا راز مغربی تہذیب میں پنہاں ہے۔[۴]

مولانا مودودیؒ کے مطابق کسی قوم کی تہذیب اس قوم کے علوم و آداب، فنونِ لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوارِ معاشرت، اندازِ تمدن اور طرزِ سیاست و نمائشی ملبوسات نہیں ہے، بلکہ

یہ سب تہذیب کے نتائج اور مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں۔[5] اگرچہ ضیاء گوک الپ کا خیال یہ تھا کہ مسلم ترکی مغرب کا استعمال کر کے مغرب پر ہی برتری حاصل کرے گی مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا اور مغرب نے ہی ترکی کو اپنا غلام بنا دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ترکی نہ تو مغرب پر اپنی سیادت قائم کر سکی اور نہ اپنے مسلم ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھ سکی۔ نتیجتاً ترکی انتشار کی شکار ہوئی اور مغربی اصطلاح میں "Torn سٹیٹ" بن کر رہ گئی۔

کبھی اسلام کا سیاسی مرکز رہی ترکی، اپنے ملک میں اسلامی ادارہ جات کو ختم کرنے لگی۔ اگرچہ ترکی کے ایک اور مفکر نامق کمال نے ترکی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان امور میں مغرب کی نقل کرے جن امور سے قوم و ملت میں ترقی ممکن ہوتی ہے۔ مگر مصطفےٰ کمال اتاترک جیسے مردِ آہن نے ضیاء گوک الپ کے فلسفہ کو ہی عملاً رائج کیا اور نامق کمال کا نظریہ محض کتابوں کی زینت بن کے رہ گیا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی کا پہلا صدر بننے کے بعد مصطفےٰ کمال نے ترکی کو غیر مذہبی (Secular) جمہوریہ میں تبدیل کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی مسلم علاقہ ہر ایک معاملہ میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہا ہو اور قوم پرستی کی بنیاد پر ایک الگ ملک کی تعمیر ہو رہی ہو۔ اتاترک ذاتی طور پر خود اسلامی تہذیب سے بدظن تھا وہ اسلام سے بھی نفرت کرتا تھا۔ وہ خدا کے وجود کے بارے مں شک میں مبتلا تھا اور سیاست اور مذہب میں تفریق کرنے والا پہلا "مسلم" حکمران تھا۔ اس نے اسلامی قانون کے بجائے سوئزرلینڈ، اٹلی، جرمنی، یورپ کے قوانین رائج کئے اور اعلانیہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک بل کے ذریعہ ترکی کو سیکولر بنا کر خلیفہ کے منصب کو ختم کر کے اسلام کی بقاء کو ترکی کے لئے خطرہ قرار دیا۔[6] مصطفےٰ کمال اتاترک کا یہ عمل اور ضیا گوک الپ وغیرہ کا یہ نظریہ رفتہ رفتہ عالم اسلام میں ایک تحریک کی طرح اُبھرنے اور پھیلنے لگا۔ ۹ اگست ۱۹۲۳ء میں قائم شدہ Republican People's Party کو مصطفےٰ کمال نے ترکی میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس نے اپنی فکر اور پروگرام کو پارٹی کے چھ نکات (Six-Arrows) میں بیان کیا۔ یہ چھ نکات یہ ہیں:

۱۔ جمہوری طرز حکومت (Republicanism)

۲۔ قوم پرستی (Nationalism)

۳۔ Populism

۴۔ Statism

۵۔ لامذہبیت (Secularism)

۶۔ انقلاب (Revolution)

بیان کردہ چھ نکات میں سے صرف نکتہ نمبر۴ (Statism) ایک ایسا نکتہ ہے جو ترکی کو شاید ترقی کی راہ پر ڈالنے کی قوت رکھتا تھا باقی پانچ نکات مغربی اثر اور اس کی مرعوبیت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اتاترک کے مطابق Statism کے تحت ترکی مختلف صنعتوں کو قائم کر کے بیسویں صدی میں ترقی حاصل کرنے کی خواہاں تھی مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا اور ترکی ایک سیکولر قوم پرست منتشر ملک ثابت ہوا۔

"تہذیب کا معنیٰ مصطفےٰ کمال کے یہاں مغربی تہذیب کا ہے۔ اس کے یہاں مغرب زدگی کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ترکی ہر طرح سے مغربی قوم بن جانی چاہیے۔ ہر وہ چیز جو اس مقصد سے متصادم تھی کو لازماً ترک کر دیا جانا چاہیے۔ اس نے بالکل ابتداء سے ہی مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے باہمی رشتہ سے پیدا ہونے والی نئی تخلیق کے خیال کو مسترد کیا تھا۔ ترکی کو مغربی تہذیب مکمل طور پر قبول کرنی چاہیے۔ اس پالیسی نے ایک ناگزیر ثقافتی بدلاؤ کو ضروری بنا دیا جو اس نے خود اپنے 'اصلاحات' (Reforms) کے ذریعہ شروع کیا۔"[۷]

موجودہ دور میں کئی مسلم ممالک کمالیت کی تحریک اپنے یہاں برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ ممالک یہ دیکھ نہیں پاتے کہ ماضی میں ترکی جس فکری اور ذہنی انتشار میں گرفتار ہوئی ہے وہ انتشار اور پراگندگی ان کے ملک کو بھی اپنے تسلط میں لے سکتی ہے۔ اگرچہ سرد جنگ کے چلتے یورپ نے ترکی کو NATO میں بحیثیت ممبر تسلیم کیا ہے مگر یورپی یونین میں ترکی کا داخلہ بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ جس کی اصل وجہ ترکی کا مسلم اکثریت

والا ملک ہونا ہے۔ جبکہ یورپی یونین عیسائی ممالک کی ایک متحدہ یونین ہے۔ یورپی طاقتوں نے یہ واضح کیا ہے کہ وہ ایک مسلم ملک -ترکی- کو یورپین یونین میں نہیں چاہتے ہیں اور دوسرے مسلم ملک -بوسنیا- کے یورپی اقلیم (Continent) میں موجود ہونے سے خوش نہیں ہے۔[۵]

پاکستان کا موجودہ صدر پرویز مشرف پاکستان کو اتاترک کی کھینچی خطوط پر ڈالنا چاہتا ہے مگر پاکستانی عوام اس کو قبول کرنے سے بالکل منکر ہے۔ اس لئے پاکستان کا موجودہ صدر پوشیدہ طور پر اس تحریک کے لئے زمین ہموار کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔

غرض کمالیت ایک ایسی تحریک تھی جس نے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے آمنے سامنے ہونے پر دنیا میں جنم لیا۔ اور جو مغرب کی اندھی تقلید کو اسلامی دنیا کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد مانتی ہے۔ مگر یہ تحریک اپنی پہلی تجربہ گاہ یعنی ترکی میں ہی پوری طرح ناکام ہوئی۔ اس تحریک کی وجہ سے پوری مسلم دنیا میں غزوۃ الفکر نے جنم لیا اور اسلامی اقدار مسلمانوں کی زندگی سے مفقود ہونے شروع ہوئے۔

تحریک استرداد (Rejectionism)

یہ ایک منفی اور سلبی رویہ ہے جس کے تحت کوئی بھی تہذیب دوسری تہذیب سے کوئی بھی صحت مند شئے یا علم لینے سے پرہیز کرتی ہے۔ اس میں عموماً ایک تہذیب دوسری تہذیب کا سرے سے انکار کرتی ہے یا پھر غیر جانبدار رہ کر دوسری تہذیب سے نہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے اور نہ اس کے منفی پہلوؤں پر بادلیل تنقید کرنے کی جرأت کرتی ہے۔ جب عالم اسلام کا مغرب کے ساتھ براہِ راست سابقہ پڑا تو کئی ایک مسلم علاقہ جات میں علماء کرام اور بااختیار افراد نے اجتہاد کے بجائے تقلید کو ترجیح دی۔ مغربی تہذیب کے دروازے سے آنے والی ہر ایک شے کو بلاتحقیق رد کیا گیا۔ جس سے بذاتِ خود اسلامی تہذیب خسارہ اور نقصان کی شکار ہوئی یہاں تک کہ طبعیات، ریاضیات اور ٹکنالوجی جیسے

علوم میں بھی وہ مغرب سے استفادۂ علمی کو حرام اور اپنے لئے "شجر ممنوعہ" سمجھنے لگے اور جدید آلات، مشینیں، ساز و سامان اور ضروریات زندگی کی اشیاء کو قبول کرنے سے بھی گریز کرنے لگے۔[9] چونکہ کسی قوم سے لڑنے کے لئے پہلے اس قوم کو قوت عطا کرنے والے اسباب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہے مگر جب کسی قوم کے تمام پہلوؤں کا بغیر مطالعہ من جملہ رد کیا جاتا ہے تو اس قوم کی ترقی کا راز بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جس سے رد کرنے والی قوم بھی اندھیرے میں رہ کر بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ اور عالم اسلام بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

"اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، اس سے عالم اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہو جائے گا اور وہ ایک محدود و حقیر جزیرہ بن کر رہ جائے گا، جس کا گرد و پیش کی دنیا سے کوئی پیوند نہیں ہوگا، سمندر میں ایسے بے شمار جزیرے ہو سکتے ہیں، لیکن خشکی میں اس طرح کے جزیروں کی گنجائش نہیں اور فطرتِ انسانی سے (جو اپنے ماحول سے کم و بیش متاثر و مستفید ہوتی ہے) جنگ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔

ان سب حقائق کے علاوہ یہ رویہ کوتاہ نظری پر بھی مبنی ہے۔ اس سے فطری قوتوں اور وسائل میں تعطل پیدا ہوتا ہے اور یہ اس دینِ فطرت کی صحیح ترجمانی اور تعبیر نہیں ہے۔ جس نے کائنات میں عقل و تدبیر کے استعمال پر بڑا زور دیا ہے اور مفید علوم میں استفادہ کی ترغیب دی ہے، جس نے دین کی حفاظت و دفاع کے لئے اور بد اندیشوں اور حریفوں کو اپنے اوپر حملہ کرنے سے محتاط رکھنے کے لئے اپنے پیروؤں کو ہر ممکن تیاری کا حکم دیا ہے"۔[10]

یہ رویہ عموماً ان لوگوں کے یہاں پایا جاتا ہے جو یا تو غیر تجربہ کار، جمود و تنگ نظری کے شکار اور قدامت پسند ہوں اور جو ملک، قوم و ملت کے انحطاط و جمود اور باقی دنیا میں مسلسل تغیر اور ترقی کو محسوس نہیں کر پا رہے ہوں۔ اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کمالیت در حقیقت استرداد کا ردعمل ہے۔ دولت عثمانیہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب ان کا

اجتہاد کے دروازوں کو بالکل بند کرنا تھا۔ اسلامی مدارس انیسویں صدی میں تیرہویں صدی عیسوی کے علوم پڑھا رہے تھے جبکہ مغرب میں علوم نے کافی ترقی حاصل کی تھی مگر اس دور کے علماء و مفکرین اس درجہ تنگ نظر اور غافل ثابت ہوئے کہ انہوں نے جمود کو اپنے لئے ترقی اور مغرب سے ان علوم میں استفادہ کو اپنے لئے ''حرام'' سمجھ لیا۔ اس کے علاوہ یورپ فنون حربہ میں بھی ترکی سے کافی آگے نکل چکا تھا جس کا ثبوت ۱۷۷۴ء میں عثمانی فوج کی شرمناک شکست میں ملتا ہے اور جب اس کا احساس سلطان سلیم ثالث کو ہوا تو اس نے نئے طرز کے انجینئرنگ کالج قائم کئے چند یورپین ماہرین فن کی خدمات حاصل کر کے فوج کی از سر نو تنظیم و تربیت کا کام شروع کیا۔ مگر ترکی اسقدر جمود پسند اور تحریک استرداد کی پیروکار بن چکی تھی کہ پرانی فوج نے بلوہ کر کے سلطان کو قتل کر ڈالا جس کا نتیجہ آگے چل کر اسلامی سلطنت کا ٹوٹنے اور بکھرنے کی صورت میں حاصل ہوا۔

جدید دور میں افغانستان کی طالبان حکومت نے مغرب کے خلاف کسی درجہ تحریک استرداد چلائی مگر اس کی یہ تحریک ان کے ''مہمان'' اسامہ بن لادن کی تنظیم القاعدہ نے Neutralize کی۔ موجودہ دور کی اکثر اسلامی دانشگاہیں، دارالعلوم و مدارس اس تحریک کے شکار ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اسلامی تعلیمات سے پوری طرح لیس تو ہوتے ہیں مگر اس اسلامی تعلیم کا عملی استعمال میدانِ زندگی میں پوری طرح نہیں کر پاتے۔ مگر اس کے باوجود عالم اسلام میں کئی ایسی اسلامی جامعات قائم ہیں جو بین الاقوامی سطح پر اسلامی اقدار کو جدید ضرورت کے مطابق دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور پوری دنیا میں کافی اثر بھی رکھتے ہیں۔

تحریکِ اصلاح (Reformation)

اسلامی دنیا میں وقتاً فوقتاً ایسے افراد نے جنم لیا ہے جنہوں نے اسلامی تہذیب کو تر و تازہ رکھنے کے لئے اجتہاد سے کام لیکر اس میں مثبت اصلاحات کیں۔ جہاں کہیں ان کو اس میں جمود، مرعوبیت، یا انتشار کے عناصر داخل ہوتے نظر آئے وہاں انہوں نے اس میں

تحرک اور تصفیہ کے صحت مند عناصر داخل کیے۔ ان کی کاوشیں معتدل اور مخلص تھیں۔ ان کی کوشش اسلامی تہذیب کو اسلام سے الگ کر کے محض جدید تہذیب بنانے کے بجائے اس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں دوسری تہذیبوں کے کچھ صحت مند پہلوؤں سے استفادہ کرنے کی روش پیدا کرنا تھی۔ مگر یہ استفادہ قرآن وسنت کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز نہیں تھا۔

تحریک اسلامی روزِ اوّل سے ہی اس استفادہ کے لئے تیار تھی۔ جہاں جہاں اسلام نے اپنے قدم جمانے شروع کیے وہاں اس نے موجودہ قدیم اور آبائی تہذیبوں سے مثبت علوم وفنون اور طرزِ زندگی کے کچھ اہم پہلو حاصل کیے ہیں۔ فارس واحد ایسا ملک ہے جہاں اسلام نے داخل ہونے کے بعد وہاں کی ثقافت کو نہیں بدلا بلکہ وہاں موجود ثقافت کو ہی اسلامیت کی روح دے کر اس کو اسلامی تہذیب کا تابناک حصہ بنادیا۔ عباسی دور میں دیگر تہذیبوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنا اصل میں ان تہذیبوں سے استفادہ کرنے کی ایک راہ تھی۔

انیسویں صدی عیسوی سے عالم اسلام میں کئی ایسے حکمران اور مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے کئی سطحوں پر اسلامی تہذیب میں اصلاحی کام کیا۔ جوں جوں اسلامی تہذیب کا تعلق مغربی تہذیب سے بڑھتا گیا اس اصلاح اور استفادہ کی کوششیں تیز ہوئی۔ سلطان سلیم ثالث، سلطان محمود، شیخ محمد بن عبدالوہاب، علامہ ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید، جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، سید رشید رضا، حسن البناء، علامہ اقبال وغیرہ اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قائدین اور مسلم رہنماؤں ومفکروں کے اندر ایک توازن پایا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب کو مکمل ماننے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید قوت کا اضافہ کرنے کی غرض سے دوسری تہذیبوں سے تحقیق اور تجربہ کے بعد جاندار اور صحت مند عناصر نقل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کو محض رسومِ زندگی اور مراسم عبادت نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس کو متحرک وجود سمجھ کر اسکو مسلسل کشمکش میں مانتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کی قوت و تکمیل سے واقف تو ہیں مگر اس میں جمود وٹھہراؤ کے متمنی نہیں۔ وہ اس تہذیب کو ہر وقت جہالت

اور طاغوت کا ہدف مانتے ہیں اور اس لئے مغرب اور دوسری تہذیبوں کے ان علوم کو ہاتھ لگانے اور حاصل کرنے کیلئے تیار ہیں جن میں اہلِ مغرب کو تفوق اور امتیاز حاصل ہے۔

یہ مسلّم حقیقت ہے کہ اسلام ''اصلاح'' کا محتاج نہیں مگر اصلاح سے ہماری مراد دین اسلام کی اصلاح نہیں بلکہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی اصلاح کرنا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ان میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں اور نقائص مسلمانوں میں سیاسی، معاشرتی، فکری، علمی، فنی، ثقافتی، اقتصادی، فوجی اور دوسری ضروری سطحوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کمزوریوں کو نظر انداز کرنا منجملہ اسلامی تہذیب کو دوسری تہذیبوں کے لئے ایک آسان ہدف بنا دیتا ہے۔ اس لئے وقت کے ساتھ ان ادارہ جات کی اصلاح کرنا اور ان کو اسلامی حدود میں رکھ کر جدت عطا کرنا ایک مصلح کا اہم کام ہوتا ہے۔

اگر ہم غیر مسلم ممالک کی طرف نظر ڈالے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ چین، جاپان، سنگاپور، تائیوان وغیرہ ایسے ممالک ہے جو ہر لحاظ سے جدید تو ہیں مگر مغرب زدہ نہیں۔ ان ممالک نے اپنی وراثتی تہذیب کے عناصر کو محفوظ رکھتے ہوئے مغرب پر سیادت حاصل کرنے کی ایک قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔ مگر انہوں نے خود کو اپنے ماضی سے الگ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غیر مغربی ترقی یافتہ ممالک مغرب کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں کیونکہ نہ تو یہ مغرب کے اجزاء ہیں اور نہ مغرب سے کسی بھی سطح میں پیچھے رہنے والے ہیں۔ الٹا یہ مغرب سے ہی استفادہ کر کے مغرب کی ہی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کھڑے رہتے ہیں۔

حواشی

1. "Are they Mujahideen or Self-seekers?" by Ishtiyaque Danish, *Encyclopaedia of International Terrorism*, Ed. Verinder Grover, N. Delhi, Deep and Deep Publications, 2002, Vol. 2., p. 473.

۲۔ ایضاً

۳۔ ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۹۵ء ص ۶۳۔

۴۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۷۷ء، ص ۸۔

۶۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۸۲۔

7. Muhammad Rashid Feroze, *Islam and Secularism in Post-Kemalist Turkey*, Pakistan, Islamic Research Institute, 1976. p. 92.

8. Huntington, *The Clash of Civilizations*, P. 126.

۹۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، لکھنو، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸-۱۹۔

باب پنجم

مغربی تہذیب فکرِ اقبال کے آئینے میں

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) ان چنندہ مفکروں میں شمار ہوتے ہیں جو مشرقی اور مغربی تہذیب کی روح سے بدرجہ اُتم واقف ہیں اور ان دونوں تہذیبوں پر عالمانہ اور شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں۔ اگر چہ اپنی پیدائش اور نسل کے اعتبار سے وہ مشرقی تہذیب سے وابستہ ہیں مگر اپنی فکری اور ذہنی جستجو کی شہ پر مغربی تہذیب کے بالکل قریب رہے اور اس طرح انہوں نے مغربی تہذیب کی روح کو اس کے ہی گہوارہ میں بخوبی محسوس کیا۔ عالم اسلام میں جہاں کئی عبقری شخصیتوں نے جن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، رشید رضا، حسن البناء، سید قطب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، نے مغرب کے بے لگام سیلاب کا مقابلہ کیا وہاں صرف علامہ اقبال کی فکر کا تذکرہ کرنا کئی اذہان میں سوالات کو جنم دے سکتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ پہلے علامہ اقبال کو دوسرے اشخاص پر ترجیح دینے کی وجوہات بیان کی جائے:

۱۔ اقبال نے مغرب اور اس کی فکر کا نہایت ہی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور پھر اعتماد سے پُر اور اپنی اصل پر یقین رکھتے ہوئے مغرب پر جرأت مندانہ تنقید بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان کو مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیتے ہیں:

> ''ان انقلابی ناقدین میں سب سے نمایاں نام علامہ محمد اقبال کا ہے، جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم جدید نے اس صدی کے اندر ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا۔ ان کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جاسکتا ہے، مشرق کے اہلِ نظر اور ذہین افراد میں (باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر کو مغرب کی سیر اور مطالعہ کا موقعہ ملا) کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب و افکار کا اتنی

گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو۔"[1]

۲۔ اقبال مغرب سے خائف نہیں ہیں اور نہ وہ اس سے حذر کرتے ہیں، بلکہ تخیل کی "عبادت" کے ساتھ ساتھ ایک دانشور اور مصلح کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔[2]

۳۔ اقبال ایسے فلسفی نہیں ہیں جو خیالی دنیا میں زندگی اور کائنات کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ ان کے دردمند دل کو جہاں کشمیر کی محکومیت، ہندوستانیوں کے سیاسی انحطاط اور مسلمانوں کی زبوں حالی کچوکے لگا رہی ہے وہاں وہ پوری انسانیت کو مغربی تہذیب کے سیل بے پناہ کی زد میں دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں۔[3] اقبال تمدنی بحالی کے خواب دیکھتے ہیں، وہ ان خوابوں کی شکست کا دکھ بھی سہتے ہیں لیکن خواب دیکھنے کے عمل سے باز نہیں آتے۔[4]

۴۔ اقبال ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے۔ وہاں ان کو براہِ راست مغربی تہذیب کے عناصر سے سامنا ہوا، جو دورۂ یورپ اور اس کے بعد ان کی زندگی کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گیا۔ یورپ میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران اقبال نے دیکھا کہ وہ اپنے ملک کی حدود سے نکل کر ایک وسیع ترقی یافتہ اور پیچیدہ دنیا میں آگئے ہیں۔ انہوں نے یورپ کی مغربی تہذیب کو برق رفتاری، روایت شکنی اور صنعتی انقلاب کی زد میں محصور پایا، اور اس کے آنے والے مضر اثرات کو محسوس کیا۔

۵۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی ہمہ گیر تباہی اور مسلمانوں کی زبوں حالی نے ان کے اندیشوں اور خدشوں کو صحیح ثابت کیا۔

۶۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے اقبال کو اور بھی متاثر کیا اور وہ عالمِ انسان میں مسلمانوں کے مستقبل کے حوالہ سے پریشان ہوئے۔

۷۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کا اختتام اور مطالبہ فلسطین کی بڑھتی اہمیت نے اقبال کو مسلمانوں کے مستقبل کے بارہ میں مضطرب کر دیا، اور وہ اس انتشار کے وجوہات پر غور و فکر کرنے لگے اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لئے تجاویز پیش کرنے لگے۔

۸۔ اقبال نہ کسی سلطنت کے دباؤ میں آئے اور نہ جامد مذہبی تصور جو صرف رسوم تک محدود ہوتا ہے کے حامی رہے اور نہ ہی نئی تہذیب یعنی مغربی تہذیب کے مخلص مقلد اور پیروکار ثابت ہوئے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال نہ قدامت اور جدت کے علمبردار تھے بلکہ وہ صرف اسی کی تبلیغ کرتے تھے جس کو وہ حق سمجھتے تھے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے لالۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند![5]

۹۔ اقبال بیک وقت، فلسفی، شاعر، سیاست دان، ماہرِ عمرانیات، قانون دان وغیرہ تھے۔ اس طرح اقبال دوسری تہذیبوں کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کرتے ہیں اور اسلامی تہذیب کو انہیں مختلف زاویوں سے دنیا کے سامنے پیش بھی کرتے ہیں۔

۱۰۔ اقبال نا اُمیدی میں بھی پر امید نظر آتے ہیں اور لوگوں کی اُمید باندھنے میں ان کو کمال حاصل ہے جو کہ ایک قائد کی صفت ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی[6]

۱۱۔ اقبال کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکثر دفاع کرنے کے بجائے مخالف کی جرأت مندانہ اور پُر مغز تنقید کرتے ہیں اور معذرت آمیز اپروچ اپنانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

بیان کردہ علامہ اقبال کی چند خصوصیات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے مصلحین اُمت ان صفات سے متصف نہیں تھے بلکہ یہاں علامہ اقبال کو ترجیح صرف اس لئے دی گئی ہے کیونکہ ان کے یہاں یہ صفات نسبتاً زیادہ نمایاں اور غالب نظر آتے ہیں۔

بقول سید نذیر نیازی اقبال کے نزدیک تمدن (Civilization) عبارت ہے اس جدوجہد سے جو انسان زندگی کے گوناگوں تقاضوں کے پیش نظر اس لئے کرتا ہے کہ اپنی احتیاجات، عزائم اور مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ لہٰذا اس جدوجہد کی ایک غایت اور ایک انتہا ہے جس میں ظاہر ہے وہ کسی نتیجے کا منتظر رہتا ہے۔ جبکہ مذہب تہذیب کے برعکس وہ نقطۂ

نظر، وہ اصول و منہاج اور وہ دستور العمل ہے جس سے اس جدوجہد کو ایک مستقل اور محکم اساس مل جاتی ہے۔ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ ہم اپنی مساعی تمدن میں خیر، سعادت اور کامرانی کا منہ دیکھ سکیں۔ لہٰذا مذہب اور تمدن باہم حلیف ہیں، یعنی دو متجاذب قوتیں جن کا وجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہے اور اسلام انہیں دو قوتوں کا پیدا کردہ ہے۔[۷] تمدن اور اسلام میں تب تصادم (Conflict) ممکن ہے جب ان دو کو باہم حلیف رہنے کے بجائے حریف بنانے کی کوشش کی جائے اور ان دو قوتوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق ٹھہرایا جائے۔[۸] اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال بھی تہذیب و مذہب کو ایک ہی سکہ کے دو پہلو مانتے تھے جن کو الگ الگ کرنا تخریب کاری سے کم نہیں۔

اقبال اشپنگلر اور دوسرے مغربی دانشوروں کی اس رائے سے قطعاً متفق نہیں ہے کہ کوئی بھی تہذیب ہو، اُسے اپنی جگہ پر ایک جسم نامی تصور کرنا پڑے گا، اس لئے کہ زمانہ دیکھا جائے تو کسی تہذیب کا اس تہذیب سے جو اسی سے متقدم ہے یا متاخر کوئی تعلق نہیں ہوگا۔[۹] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مطابق اقبال امتوں اور تہذیبوں کے لئے اجل کے تو قائل ہے لیکن اہل مغرب نے جو یہ خیال پھیلا دیا ہے کہ کوئی امت دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی، اقبال اس کو غلط مانتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ خیال زوال یافتہ مشرقی اقوام کو مایوس کرنے کے لئے ان کے ذہنوں میں ڈالا گیا ہے۔[۱۰]

علامہ اقبال اقوام کی ترقی و زوال میں افراد کو مرکزی حیثیت عطا کرتے ہیں اور افراد کو اقوام کی تقدیر اور ملت کے مقدر کا ستارا مانتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تہذیبوں کی ترقی کے لئے افراد کو مخاطب کرتے ہیں مگر ساتھ ہی افراد کو اجتماعیت کی اہمیت کا احساس کراتے ہوئے جماعت میں رہ کر ان کو اپنی تہذیب کی ترقی کے لئے تگ و دو کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ کیونکہ ربطِ ملت ترقی اور آبرو کی ضامن ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا[۱۱]

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں [۱۲]

اقبال نے نظریۂ تغیر پر پائیدار اور زندہ تمدنوں کا انحصار ثابت کیا ہے۔ وہ قرآن کے تناظر میں کہتے ہیں کہ تغیر ایسی زبردست حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ایک تمدن کو پائیداری اور زندگی فراہم کرتا ہے۔ اگر کوئی قوم اس تغیر سے غفلت برتتی ہے یا اس کو قابو میں لانے کی کوشش نہیں کرتی تو وہ قوم دنیا میں قائم نہیں رہتی۔ قدیم تہذیبیں اس لئے زوال پذیر ہوئی کیونکہ انہوں نے اس اہم حقیقت کی طرف توجہ نہیں دی۔ [۱۳] اقبال اس امر کو واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ تغیر اقوام کی طاقت ہے اور محض نظریوں پر کوئی قوم یا تہذیب قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں طاقت قائم نہ ہو۔ [۱۴]

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں [۱۵]

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
زنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار [۱۶]

وہ جب مشرقی اور مغربی دنیا کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں تو وہ مغرب کی ناکامی ان کے تاجرانہ نظام اور کردار میں دیکھتے ہیں جبکہ مشرق کی افلاس اور زوال کے آثار ان کو مشرق کی راہبانہ زندگی اور جمود میں نظر آتے ہیں۔

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ [17]

اقبال اسلامی ثقافت اور تہذیب میں بھی جمود کے سخت مخالف ہیں اور اس میں تحرک کے قائل ہے۔ وہ اسلامی ثقافت وتہذیب کی اساس فرد کی ذاتی قدر وقیمت پر رکھتے ہیں اور اس کو بطورِ نظام اجتماع پیش کرتے ہیں اور اسی لئے موجودہ دور میں اجتہاد کرنے کی دعوت بھی دی۔

> ''تہذیب وثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے۔ بعینہ جہاں تک بطور ایک نظامِ اجتماع جذبات سے کام لینے کا تعلق ہے، اس نے رنگ وخون کے رشتے ٹھکرادئے اور اپنی توجہ صرف فرد کی ذاتی قدر وقیمت پر رکھی''۔ [18]

وہ اسلامی تہذیب کو ایک ایسی تہذیب مانتے ہیں جو دوسری تہذیبوں کے اثر سے بالکل پاک رہی ہے اگرچہ بعد میں کچھ غیر اسلامی تہذیب کے عناصر نے اس تہذیب میں جگہ لی مگر اسلامی تہذیب کا ظہور دنیا کے اس علاقہ میں ہوا جو علامہ اقبال کے نزدیک قدیم تہذیبوں کے اثرات سے یکسر پاک اور صاف تھا۔ یہ نئی تہذیب اتحاد عالم کی دعوت دینے لگی جس کی بنا اصول توحید پر رکھی گئی ہے۔ [19]

علامہ اقبال کے خطبات کا جائزہ لیتے ہوئے محمد شریف بقا کا کہنا ہے کہ اقبال کا ماننا تھا کہ اسلام اپنے ماخذ الہام کی بناء پر قدیم لیکن اپنی روح کے لحاظ سے جدید دور سے تعلق رکھتا ہے۔ [20] لیکن علامہ اس امر پر پُر افسوس نظر آتے ہیں کہ پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے۔ [21] اور وہ مردہ اور جامد مذہب میں حرکت اور تغیر کی اقامت کی دعوت دیتے ہیں۔ انکے یہاں اس جمود کے مرض کی دوا صرف اجتہاد میں پنہاں ہے۔ [22]

وہ کہتے ہیں کہ طاغوت کے لئے جو تحریک یا ثقافت یا تہذیب ''خطرہ'' بننے کی اہلیت رکھتی ہے وہ صرف اسلام ہے۔ جب مسلمان اپنی تہذیب میں حرکت اور تحرک کو پیدا کرتا ہے تو ایسا مسلمان ہی نظام طاغوت کو للکارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی مشہور تخلیق

''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں وہ ابلیس (یعنی نظامِ طاغوت کے قائد) کی زبان سے اس منتشر اُمت میں شرارِ آرزو کے وجود کو طاغوتی نظام کیلئے سب سے بڑا خطرہ شمار کرتے ہیں۔

ہے اگر مجھ کو خطرہ کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے [۲۳]

ابن خلدون کی طرح علامہ اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب کوئی تہذیب بامِ عروج پر پہنچ جاتی ہے تو ایسی تہذیب شرافت کا لباس اُتار کر غارت گر بن جاتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ اس تہذیب کے زوال کا باعث بن جاتا ہے۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش [۲۴]

دورِ حاضر کی مغربی تہذیب پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ اقبال اس حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں کہ اگرچہ اسلامی اور مغربی تہذیب کی بنیادیں بالکل مختلف ہیں مگر اس کے باوجود مغرب کے بعض پہلو اسلامی تہذیب سے ہی لئے گئے ہیں۔ اس طرح مغربی تہذیب نے اسلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ [۲۵] یورپ نے اگرچہ اس حقیقت کو بہت دیر میں تسلیم کیا کہ سائنس کا منہاج دراصل مسلمانوں کی دریافت ہے لیکن بالآخر اسے اس کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔ سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب و ثقافت نے جدید دنیا کی کی ہے وہ سائنس ہے۔ [۲۶] یورپ جو کہ ظلمت میں ڈوبا ہوا تھا اسلامی تہذیب کی وجہ سے خوابِ غفلت سے بیدار ہوا۔ اسلامی تہذیب میں اندلس (اسپین) ایک ایسا باب ہے جو نہ صرف روشن ہے بلکہ اندلس یورپ کی آغوش میں اسلامی تہذیب کا نمایاں اور تابناک نمائندہ تھا۔ اسی تہذیب سے یورپ نے استفادہ کر کے اپنی ظلمت اور پراگندگی کو دور کیا۔

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشان کرگئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کرگئی [۲۷]

وہ کہتے ہیں کہ مغرب کی موجودہ صورت فرانسیسی انقلاب کے بعد نمایاں ہوئی۔ وہ رومی تہذیب کی احیاء کو مغربی تہذیب کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب نے مغربی دنیا کو جدید نظریات دیئے جن کو سامنے رکھ کر مغربی تہذیب مستقبل میں ایک ایسے سیلاب کی مانند بڑھی جس کو روکنا بہت مشکل نظر آنے لگا۔

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں [۲۸]

وہ مغربی نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی سخت الفاظ میں تردید کرتے ہیں اور یہ واضح کرنے کی پیہم اور مسلسل کوشش کرتے ہیں کہ مغربی نظریات یا نظام بنیادی طور پر نقائص کے شکار ہیں۔ جمہوریت کے معاملے میں علامہ اقبال اس نظام جمہور کے متمنی تھے جس کو اسلام نے پیش کیا تھا مگر مسلم دنیا نے اسلامی جمہوری نظام کو اپنانے کے بجائے مغربی جمہوری نظام کو پسند کیا۔ وہ مغربی جمہوریت کے اس طریق کار کے مخالف تھے جس کی وجہ سے قوم کے صالح اور عاقل افراد مجلس آئین ساز میں داخل نہیں ہوسکتے ہیں۔ [۲۹] وہ مغربی جمہوری نظام میں عاقل اور صالح افراد کی حصہ داری پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے [۳۰]

وہ مغربی جمہوری نظام کو اصل میں ایک پرانا نظام کہتے ہیں جو استبدادی اور استعماری

مقاصد کی حفاظت کے لئے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ وہ مسلم اقوام کو اس سے دھوکا کھانے سے ہوشیار کرتے ہیں اور ان پر اس کی اصلیت واضح کرنا چاہتے ہیں۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے بیٹھے اثر خواب آوری[۳۱]

وہ مغربی تہذیب کی ظاہری خوبصورتی کے بجائے اس کی اندرونی غلامی اور بدصورتی کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری[۳۲]

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر[۳۳]

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے نظریۂ جمہوریت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب مغلوب اقوام میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور وہ حکمران سے اقتدار میں حصہ طلب کرتے ہیں تو حکمران سب سے پہلے یہ چال چلتا ہے کہ بہت اچھا، کہہ کر ایک مجلس آئین ساز بنا دیتا ہے۔ لیکن نمائندوں کے انتخاب کے قواعد ایسے بنا دیتا ہے کہ اس میں حکومت کے پروردہ زمیندار یا سرمایہ دار لوگ ہی داخل ہو سکیں جس میں حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہو، اس طرح جمہوریت کا دھوکا بھی پیدا ہوتا ہے لیکن استبداد میں کوئی فرق نہیں آتا"۔[۳۴]

علامہ اقبال نے اس جمہوریت پر سخت تنقید کی ہے اور مغربی تہذیب کے پیروکاروں کو اس تہذیب کے نقائص اور نظاموں کی کمزوری سے متعارف کیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کا

جمہوریت کے حوالے سے کیا گیا یہ تجزیہ اقبال کے اس شعر میں سمایا ہوا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر [35]

اسی طرح اقبال قوم پرستی (Nationalism) کی بھی تنقید کرتے ہوئے اس کو نہ صرف ملت اسلامیہ کے لئے موت قرار دیتے ہیں بلکہ اقوام مغرب کے لئے بھی اس کو زوال کا سبب شمار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وطنی قومیت کے نشوونما سے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائص پر ہے وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے۔ لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے عالم اسلام کی تاریخ! یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، نہ شاعرانہ خواب بلکہ روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو چپکے چپکے اور غیر محسوس طریق پر اپنا کام کرتا رہا۔ [36] وہ قوم پرستی کو نئی تہذیب کا تراشہ ہوا نیا بت مانتے ہیں اور اس کو اسلام کا کفن کہتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے [37]

وہ مسلمانوں کو اس دین کش نظریہ سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اسلامی تہذیب اور اسلام کی آفاقیت کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ اسلام کو علاقوں اور ملکوں سے بالا کہتے ہیں اور اسلامی تہذیب کو بین الاقوامی تہذیب (Pan-Islamic Civilization) کہتے ہیں۔ وہ مسلمان کو وطن سے منسوب کرنے کے بجائے اسلام سے نسبت رکھنے پر تیار کرتے ہیں۔

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہندی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام [38]
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے [39]

وہ ملکوں کے زوال کو اسلامی تہذیب کا زوال نہیں مانتے ہیں اور مسلم کی بقا کو ممالک و

سلطنتوں کی بقا کے ساتھ مشروط نہیں سمجھتے۔ وہ مسلم ملت کو ایک الگ قوم تصور کرتے ہیں جو مقام و ملک کی حدود و قیود سے پوری طرح آزاد ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے[۴۰]

وہ مسلمان قوم کے لئے توحید و شرک کا معرکہ اسلام و وطن پرستی کے معرکہ میں محسوس کرتے ہیں اور وطن پرستی کو شرک قرار دیتے ہیں۔ وہ وطنیت کو خدا کے خلاف کی گئی بغاوت تصور کرتے ہیں اور ایک مسلمان کو اس بت کو توڑنے کے لئے اُبھارتے ہیں۔

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھادے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے[۴۱]

اقبال مسلسل مادیت اور روحانیت کی جنگ کو اپنے خطابات اور شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ وہ مشرق کی ناکامی کو جہاں جمود کا ثمر بتاتے ہیں وہیں مغرب کی ناکامی تاجرانہ ضمیر اور مادی روح کو شمار کرتے ہیں۔[۴۲] وہ کہتے ہیں کہ انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ سیاسی اعتبار سے افراد افراد سے متصادم ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوعِ زر پر قابو حاصل کر سکے۔[۴۳] یورپ جو کہ مغربی تہذیب کا گہوارہ تھا روحانی فیض سے بالکل خالی ہے۔ اس میں مشرق کی طرح وحی اور تنزیل کی تراوت موجود نہ تھی۔ اسی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اقبال یورپ کو انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ مانتے ہیں۔[۴۴] وہ یورپی تہذیب کو اخلاق سوز حرکات اور فحش اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور اس کی زر پرستی اور غارت گری پر تنقید کرتے ہیں۔

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات[۴۵]

اقبال مغرب کی اس صورت حال کو دیکھ کر اس کو فساد کا شکار کہتے ہیں۔ وہ اس کی بگڑتی ہوئی اخلاقی اور سیاسی صورت حال کی طرف انگشت نمائی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جس تہذیب کی صورت حال اتنی ابتر ہو وہ تہذیب قطعاً آفاقی یا بین الاقوامی تہذیب (Universal Civilization) نہیں بن سکتی۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف[۴۶]

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ بیچارہ زن شناس نہیں[۴۷]

وہ اس ابتر حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی کئی وجوہات شمار کرتے ہیں، جن میں حصول زر پر مبنی ظالم سرمایہ دارانہ نظام اور ضمیر کی موت جیسی وجوہات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ہر اس تہذیب و تمدن کے استحکام کے بارہ میں سوالیہ نشان لگاتے ہیں جس کی بنا محض حصول زر ہو جبکہ مشرق کی ابتری ان کے یہاں خودی کی موت کا نتیجہ ہے۔

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے[۴۸]

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت[۴۹]

وہ مغربی تہذیب کے بناوٹی خدوخال اور اس کے فطرت کے مخالف روش اختیار کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ اس نئی تہذیب کو محض تکلف اور ظاہری دکھاوا کہتے ہیں۔

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش[۵۰]

اس طرح اقبال نے ریاست و مذہب کو الگ کرنے پر اپنا خیال اور نظریہ پیش کیا ہے۔ اقبال نے اپنے زمانہ میں مصطفٰے کمال اتاترک کی سیاسی زندگی کو دیکھا۔ انہوں نے خلافت عثمانیہ کے اختتام کے تلخ تجربہ کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس وقت جب عالم اسلام سکتہ کی حالت میں تھا، اقبال نے اس پر زبان اور قلم سے اظہار خیال کیا۔ چونکہ اقبال دوسرے مفکروں کی طرح مسلسل ارتقا میں نظر آتے ہیں اس لئے ان کے اُسی نظریہ کو یہاں پیش کیا جاتا ہے جس نظریہ پر اقبال کا خاتمہ ہوا۔ یہ ایک امر یقینی ہے کہ انسان اپنے کئی خیالات سے اپنی زندگی میں رجوع کرتا ہے جس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ چونکہ اقبال نے بھی کئی مسائل اور نظریوں سے رجوع کیا جو اس کے فکری ارتقاء اور نظریاتی ترقی کی روشن دلیل ہے اور اقبال کے نظریہ تغیر کا عملی ثبوت بھی۔

جہاں تک سیکولرازم کا تعلق ہے وہ اس کو غلط اور گمراہ نظریہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی رُو سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام کے اندر بھی کوئی ثنویت - مذہب اور ریاست - کام کر رہی ہے۔ حالانکہ اسلام میں اس کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔[۵۱] وہ عیسائیت کے فساد کے مقابلے میں اسلام کے اس پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں کہ قرآن مجید نے مذہب اور ریاست کا مسئلہ ایک ہی تنزیل میں جوڑا ہے۔[۵۲] وہ انسانیت کی حفاظت دین و سیاست کے اتحاد میں دیکھتے ہیں اور ان دو میں تفریق کے پڑ جانے میں انسانیت کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی ملک چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظتِ ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی وارد شیری [۵۳]
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی [۵۴]

وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ تہذیبیں مراکز سے جڑ کر قائم رہتی ہے اگر مرکز سے جدائی واقع ہو تو قومیں رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتی ہیں اور بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی [۵۵]

وہ ترکی میں ترک وطن پرستوں کی طرف سے کی گئی سیکولرازیشن (Secularization) یا ریاست اور اسلام کی تفریق کا اصول مغربی سیاست کی تاریخ و افکار سے اخذ شدہ مانتے ہیں۔[۵۶] وہ ترکی کے انقلابی مصطفٰے کمال اتاترک کے ''کارناموں'' خصوصاً خاتمۂ خلافت سے کافی مضطرب نظر آتے ہیں اور اس ''نادانی'' پر کفِ افسوس ملتے نظر آتے ہیں۔

چاک کردی ترکِ نادان نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ [۵۷]

یہی وجہ ہے کہ وہ سیکولرازم سے متفق نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام مسلم حکمرانوں کو جو اسلام اور سیاست کو الگ الگ کرتے ہیں، اسلام کے اصلی رہنما نہیں مانتے اسی لئے وہ مصطفٰے کمال اور ایران کے رضا شاہ کو بھی ان کے اسلام مخالف رویہ اپنانے پر قبول نہیں کرتے۔ وہ ان کو مغرب کا ذہنی اور فکری غلام شمار کرتے ہیں۔

نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی [۵۸]

ان تمام نقائص اور کمزوریوں کو بیان کرنے کے بعد اقبال پوری جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے متعلق اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ وہ اہلِ مغرب کو مخاطب کر کے ان کو زوال

سے نہیں بلکہ دہشت ناک خاتمہ سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس پیشین گوئی کو قانون قدرت کی کتاب زیرِ نظر رکھ کر بیان کرتے ہیں۔ جب وہ مغربی تہذیب میں وہ سب نقائص موجود پاتے ہیں جو نقائص دوسری تہذیبوں کے زوال کے باعث بنے ہیں، تو وہ اس کا انجام ان زوال پذیر تہذیبوں سے مختلف نہیں سمجھتے۔ وہ ان کو اپنی کمزور تہذیب کے بارے میں دھوکے کا شکار اور اس دھوکہ کو ان کے لئے آبِ سم تصور کرتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا[۵۹]

اقبال کا نظریۂ ردوقبول۔ مغربی تہذیب کے حوالہ سے

اقبال کی فکر اصلاحی فکر ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک تحریک ہے جو مشرقی تہذیب۔ اسلامی تہذیب۔ کی نشاۃ الثانیہ کی متمنی ہے۔ اقبال نہ قدامت کا داعی ہے نہ جدت کا پیغامبر۔ وہ صرف اصلاحِ امتِ اسلامیہ کا منتظر ہے۔ وہ مسلمانوں میں معاشرتی، فکری، علمی، فنی، ثقافتی، فوجی اور دوسری اہم سطحوں پر اصلاح کا خواہاں ہے۔ اس اصلاح کے لئے وہ مغرب سے صحت مند اور غیر ضرر رساں عوامل حاصل کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ مغرب اور مشرق میں موجود کمزور اور تہذیب کش عوامل و عناصر سے پرہیز کرنے کی صلاح بھی دیتا ہے۔ اقبال مغرب کے عیوب کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں سے بھی بخوبی واقف اور ان کا مداح تھا اور چاہتا تھا کہ مسلمان وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کریں۔[۶۰] اقبال نہ مشرق کا اندھا طرفدار ہے اور نہ مغرب کا اندھا مقلد بلکہ وہ غیر جانبداری سے کام لیکر ملت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے میدان میں کودتا ہے۔

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر[۶۱]

علامہ اقبال پوری طرح اسلامی تہذیب کی نہج اور اس کے بدلتے خدوخال سے واقف تھے۔ وہ نبض شناس تھے اور امت اسلامیہ کے رگ و پے سے بدرجہ اُتم متعارف تھے۔ چونکہ دولت عثمانیہ و خلافت اسلامیہ کے اختتام کے بعد اسلامی تہذیب چوراہے پر کھڑی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ عالم اسلام کے کئی ذہین اور قابل دماغ مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر ہو رہے ہیں اور عالم اسلام کے سوچنے والے کئی ذہن مغربی خدوخال کے فکری غلام اور مقلد بنتے جا رہے ہیں۔ اپنے اس تجربہ کی بنیاد پر ان کے ذہن میں کئی خدشات نے جگہ لی جس کی طرف انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں واضح اشارہ کیا ہے:

> ''تاریخ حاضر کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالمِ انسانیت نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب و تاب کہیں اس تحریک میں خارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔''[۶۲]

وہ اس امر سے سخت پریشان نظر آتے ہیں کہ مشرق مغرب کی تقلید کر رہا ہے۔ جبکہ مغرب بذات خود مادیت کا دیوانہ ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کی الگ پہچان (Identity) کے قائل ہیں اور عالم اسلام سے یہ راز جاننے کی نصیحت کرتے ہیں۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہِ فلزات[۶۳]

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ[۶۴]

علامہ اقبال ان مسلم مقلدوں پر کفِ افسوس ملتے ہیں جو اپنی اسلامی تہذیب کی احیاء کو مغربی تہذیب کی تقلید کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ وہ ان انتہا پسند مبلغوں کو یہ سمجھانے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب خود زوال و فساد کی شکار ہے، اس لئے اس سے اپنی کمزور ثقافت کو بدلنا بے سود ہے۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور![65]

وہ ترکوں کی اس نادانی پر بہت مضطرب ہیں کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے اثر کے تحت وطن پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا اور عربی ثقافت سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی نہ مغرب بن گئی اور نہ مشرق ہی باقی رہی بلکہ وہ ایک منتشر ریاست (Torn State) کی صورت میں دنیا میں قائم تو رہی مگر اپنی عزت کھو دی۔

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر — حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہازِ بیابان شتر کا نام — ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے[66]

وہ اس ذہنی غلامی اور احساس کہتری اور مقلدانہ کردار کے چلتے کسی ذہنی محکوم سے اُمت مسلمہ کی اصلاح کی اُمید رکھنے سے پناہ مانگتے ہیں اور غلام قوموں کے علم و عرفان اور بصیرت پر بھروسہ کرنے سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ غلاموں اور محکوموں کی اصلاحی تحریکات کے بارے میں نفاذ مغربیت کا خدشہ ظاہر کرتے ہیں اور تجدید اُمت میں تجدد اُمت کا پروگرام پنہاں ہونے کے خدشہ سے مسلم ملت کو آگاہ کرتے ہیں۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا[67]

غلام قوموں کے علم و عرفان کی ہے یہی رمزِ آشکارا
زمین اگر تنگ ہے تو کیا ہے، قضائے گردوں ہے بے کرانہ [۶۸]

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورت چنگیز [۶۹]

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ [۷۰]

اقبال کا ماننا ہے کہ پچھلی پانچ صدیوں سے عالم اسلام پر جمود طاری رہا اور عالم اسلام ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند میں غافل رہا، اس دوران یورپ نے ان مسائل وعلوم میں گہرے غور وفکر سے کام لیا جو مسائل وعلوم اسلامی دنیا نے اپنی علمی ترقی کے دوران پروان چڑھائے تھے۔ [۷۱] اور جب مغربی تہذیب پھر سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اور عالم اسلام پر سیلاب کی طرح چھانے لگی تو عالم اسلام اپنی غفلت سے بیدار ہوا اور اپنا تشخص و پہچان پھر سے ڈھونڈنے لگا۔

مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی [۷۲]

مگر اقبال اس راز سے واقف ہے کہ عالم طاغوت اسلامی دنیا کو عالم میں اپنا کردار نبھانے سے غافل رکھنا چاہتا ہے تاکہ پوری دنیا اسلامی دنیا کو غلام بنا کر اپنے مفادات حاصل کریں۔ اپنے ان الفاظ کو اقبال ابلیس کے منہ میں ڈال کر اُمت کو ابلیسی حربہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر خواہی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات [۷۳]

اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کے تہذیب کش عناصر

اقبال عالم اسلام کے خلاف مغرب کی طرف سے بنائی گئی سازشوں اور چالوں سے پوری طرح واقف تھے۔ان کی نظر بالغ تھی، ان کی سوچ بلند تھی اور ان کا تجربہ پختہ تھا۔وہ اپنی ان صفات کی بناء پر آنے والے واقعات یا کسی عمل کے عقب میں موجود مقصد کو سونگھنے کی اس قدر طاقت رکھتے تھے کہ وہ پیشین گوئیاں کرتے گئے جو آگے چل کر صحیح ثابت ہوئیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد فاتح سامراجی ممالک نے لیگ آف نیشنز (League of Nations) کا قیام عمل میں لایا۔اس کی اقامت میں امریکہ اور برطانیہ نے کلیدی رول ادا کیا اور امریکہ کے صدر وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) نے اس کی فوری اقامت پر بہت زور دیا۔۱۹۲۰ء کی دہائی میں اس کا مرکزی دفتر جنیوا میں قائم تھا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں اس کو اقوامِ متحدہ (United Nations Organisation) سے بدل دیا گیا۔چونکہ اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہو چکی تھی اس لئے وہ صرف لیگ آف نیشنز سے ہی واقف تھے اور اس کے نتائج اور مقاصد سے پوری طرح مانوس نظر آتے ہیں۔وہ اپنی ایک مختصر نظم ''مکہ اور جنیوا'' میں اس لیگ کے مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں۔

تفریقِ ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم [۷۴]

اقبال لیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے مقاصد کی نقاب کشائی فرما رہے ہیں اور امت مسلمہ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ لیگ مسلم ملت کو ملکوں کے نام پر بانٹنا چاہتی ہے اور اسلام کے عنصرِ اتحاد کو ختم کرنا چاہتی ہے۔وہ اس تنظیم کو مغرب کا ایک ہتھیار سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ اسلامی اتحاد کا پارہ پارہ کیا گیا۔

اقبال اس راز کو بھی وا کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب اگرچہ نئی تہذیب ہے لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ یہ تہذیب جلد ختم ہو جائے گی مگر اقبال اس حقیقت کا اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ دنیا کی قلیل یہودی آبادی مغربی تہذیب کی باگ دوڑ سنبھالنے کی بنا پر اس تہذیب کی لگام اپنے ہاتھ میں لے گی۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ اصل میں لیگ آف نیشنز [اور اقبال کے بعد قائم ہوئی تنظیم اقوام متحدہ] یہودی سازش کا خطرناک حصہ ہے۔ اور بالعموم یورپ اور بالخصوص برطانیہ یہودی شکنجہ میں گرفتار ہے۔ آگے چل کر یہ ثابت ہوا کہ لیگ اور اقوام متحدہ ہی بعد میں فلسطین میں ناجائز یہودی ملک اسرائیل بسانے کے لئے بحیثیت آلہ استعمال ہوئے۔ اسلئے وہ مسلمانوں کو ان تنظیموں سے اُمید نہ لگانے کی صلاح دیتے ہیں:

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جوانمرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی![۷۵]

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے[۷۶]

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخوار
جن کی روباہی کے آگے، ہیچ ہے زورِ پلنگ![۷۷]

وہ دوسری طرف عیسائیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے غافل نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عیسائی ممالک پوری طرح اس تگ و دو میں لگے ہیں کہ کس طرح اسلامی ممالک سے بالعموم اور عرب ممالک سے بالخصوص قدرتی وسائل حاصل کر کے عیسائیت اور مغربیت کے تسلط کو برقرار رکھا جائے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز![۷۸]

اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مغربی مسلمانوں کو مسلمانوں کے ذریعہ ہی غلامی کا درس دلواتے ہیں۔ علامہ اقبال اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مغرب و دیگر مسلم کش ممالک چاہتے ہیں کہ مسلم پوری طرح غلامی قبول کریں۔ اس کے لئے وہ علماء، شاعر، حکما وغیرہ کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ مسائل کی تاویلات کر کے ان کو تحریک اور حرکت سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جہاد کے بجائے صبر کی تلقین کی جاتی ہے۔ عملی مقابلہ کے بجائے قلمی مقابلوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور انصاف حاصل کرنے کے بجائے ظلم سہنے کی نصیحت کی جاتی ہے۔ اقبال ہر وقت انقلاب اور حرکت کے جذبوں سے لبریز نظر آتے ہیں۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر[79]

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر[80]

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ[81]

اقبال ان حالات کو دیکھ رہے تھے اور جانتے تھے کہ مغرب کس طرح مسلم قوم کو یرغمال بنا کر اس پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش میں لگا ہے۔ وہ مسلمانوں میں موجود تصورِ رسالت، غیرت اور فکری بلندی کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے اور اس تاک میں بیٹھا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ختم کیا جائے جس کیلئے وہ جسمِ مسلم کو ختم کرنے کے بجائے روحِ مسلم کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مغرب فکرِ عرب کو فکرِ فرنگ سے بدلنے کی کوشش کر رہا ہے تا کہ ان کے مشرقی جسم مغربی ذہن کی پرورش کریں اور انکے مغربی ذہن عربی قوم کو اسلام سے دور اور مغرب کے قریب لا کر ان کی جھولی میں ڈال دیں۔ اسی طرح مغرب اہلِ حرم کی روایات

اور افغانیوں کی غیرت کو ختم کرنے میں مغربی تہذیب کی سلامتی اور بقا مضمر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ان تجربوں کو ابلیس کے منہ میں ڈال کر یوں بیان کرتے ہیں۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے بیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو[۵۲]

اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مغرب نے جس آلہ کا زیادہ استعمال کیا ہے وہ آلہ اقبال کے نزدیک مغربی تعلیم ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ مغربی تعلیم سے مشرقی اپنی پہچان کھو دیں گے اور وہ اپنے لئے مغربی پہچان کو بآسانی تسلیم کریں گے۔ اس طرح فرنگی چال کامیاب ہوئی اور مشرق کے مدارس مغربی تہذیب کے ایسے اڈے اور فیکٹریاں بن گئی۔ جہاں مغربی سوچ اور مغربی فکر کی حفاظت ہوتی ہے اور مشرقی سوچ و فکر کو سر سے کچلنے کی پیہم، مسلسل اور منظم سعی ہوتی ہے۔ اقبال اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے اس حقیقت کو ایک فرنگی کی زبان سے ادا کرواتے ہیں جو اپنے بیٹے سے یوں مخاطب ہے۔

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اِک ڈھیر [۸۳]

اقبال مانتے ہیں کہ مغربی علوم ایسے نظرئے رکھتے ہیں جو ملت اسلامیہ کی روح اور مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ وہ وطن پرستی، سیکولرازم، جمہوریت وغیرہ کے ایسے نظرئے اور عناصر کے علمبردار ہیں کہ اسلامی اتحاد ٹوٹ کر اکائیوں میں بٹ جاتا ہے۔

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو دیتا ہے گاز [۸۴]

غرض اقبال مغربی تہذیب کے ہر لحاظ سے واقف کار تھے۔ وہ اسلامی تہذیب میں داخل شدہ کمزور اور اصلاح طلب عناصر کو بھی خوب جانتے تھے۔ اس لئے اقبال محض شاعر نہیں بلکہ حالات و واقعات کے محرم راز ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کے کلام اور فکر نے پوری طرح مغرب کو جو جواب دیا ہے وہ افراط و تفریط کے بجائے اعتدال پر مبنی ہے۔ اور وہ اپنے اندر ایک تجزیہ نگار کی صلاحیت اور ایک اصلاح کار کا ہنر رکھتے ہیں۔ اس لئے اقبال نے اپنے بارے میں شاید یہ صحیح کہا تھا ؎

میری نوائے پریشانی کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درونِ میخانہ [۸۵]

اقبال کا مغربی تہذیب کے خلاف ردعمل

اقبال نے جہاں مغربی تہذیب پو چوٹ کی ہے اور واضح کیا کہ مغرب کس طرح اسلامی تہذیب کی بیخ کنی کر رہا ہے وہیں اقبال نے مسلم قوم کو زوال اور پستی سے نکالنے اور

ان کے منتشر شیرازہ کو پھر سے جوڑنے کے لئے امت کی اصلاح کی غرض سے کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔ چونکہ اقبال مصلح وقت تھے اور اصلاحِ امتِ مسلمہ کے کام سے جڑے ہوئے تھے اسلئے اقبال نے اُمتِ مسلمہ کو زوال اور تنزل سے نکالنے کیلئے مندرجہ ذیل مشورے دئے۔

اقبال مسلمان ملت کو جدید دنیا کے تقاضوں کو سمجھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ امت مسلمہ کا حال دیکھ کر کہتے ہیں کہ اس ملت کے امراض کی اگر کوئی دوا ہے تو وہ تعلیم ہے۔ وہ اس تعلیم کو مغربی تعلیم سے مختلف چاہتے ہیں جس میں جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی روح کی مانگوں کو بھی پورا کیا گیا ہو۔ وہ فرماتے ہیں۔

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لئے تعلیم مثلِ نشتر [۸۶]

وہ اس علم کے ساتھ بصیرتِ مسلم کو مشروط کرتے ہیں اور بصیرتِ مسلم کو طاقت وقوت کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر بصیرت طاقت وقوت سے خالی ہو تو ایسا علم کوئی زندہ وجاوید تمدن قائم نہیں رکھ سکتا۔ [۸۷] کیونکہ کوئی پائیدار تہذیب محض نظریوں پر قائم نہیں رہتی بلکہ وہ طاقت وقوت کی بھی طالب ہوتی ہے۔ [۸۸]

وہ ملت بیضا یعنی امت اسلامیہ کے نجات کی اساس ربط وضبط امت قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایشیا اس نکتے سے بالکل بے خبر ہے کہ اُمت اسلامیہ ربط وضبط سے نجات پاسکتی ہے۔

ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بیخبر [۸۹]

اقبال اجتہاد کی کھلم کھلا دعوت دیتے ہیں اور امت مسلمہ کی ترقی کے راز کو اجتہاد میں پنہاں مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، محض ایک افسانہ ہے۔ [۹۰] وہ اس نظریہ کو اسلامی تہذیب کی اندرونی روح کے منافی مانتے ہیں اور علامہ ابن تیمیہؒ کی فکر کے مغز کو ان کی طرف سے جمود کے خلاف بلند کی گئی آواز قرار دیتے ہیں۔ وہ

سمجھتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہؒ کی فکر اور تحریک اسی اندرونی اجتہادی عنصر کی وجہ سے پورے عالم میں بالواسطہ یا بلاواسطہ تحریک پیدا کر رہی ہے۔[۹۱]

وہ عالم اسلام میں اجتہاد کی بنیاد پر تحریک کے علمبردار ہیں اور جہاد و اجتہاد کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ مسلم قوم کو غم و الم اور انتشار و پراگندگی سے نکلنے کی دعوت دے رہے ہیں اور اس پریشان حالت کو مغرب کی کارستانی بتاتے ہیں۔

غمگین نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ[۹۲]

شیخ محمد ناصر الدین الالبانیؒ کی طرح اقبال بھی امت مسلمہ میں تصفیہ و تربیہ کی تحریک چلانے کے قائل تھے۔ وہ ملت اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت کو غیر اسلامی عناصر اور ملاوٹوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلامی تہذیب کو پاک و صاف کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اسلامی تہذیب اپنا تشخص قائم اور برقرار رکھ سکے۔ کیونکہ کسی تہذیب کا دوسری تہذیب کے عناصر اپنے اندر جذب کرنے میں اس تہذیب کی یا تو ترقی ہو سکتی ہے یا وہ تہذیب مستعار لئے عناصر کے غلبہ کی وجہ سے اپنی پہچان کھو دیتی ہے۔ چونکہ ملت اسلامیہ کی تہذیب میں کچھ مہلک غیر اسلامی عناصر داخل ہوئے ہیں جو اسلامی تہذیب کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہیں بلکہ وہ اسلامی تہذیب کی روح کو مجروح کرنے میں لگے ہیں۔ علامہ اقبال ان عناصر کو اسلامی تہذیب سے الگ کرنے کی تاکید کرتے ہیں تاکہ اسلامی تہذیب زوال کی پستی سے نکل کر اوپر اُٹھ سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام پر مجوسیت کا ایک غلاف چڑھ گیا تھا جس نے اسلام کی حقیقی روح پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس لئے وہ خود بھی ان غلافوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسلام کا صاف ستھرا چہرہ دیکھ سکیں۔[۹۳] اسی طرح وہ مسلمانوں کو عیسائی وضع اور ہنود (ہندوؤں) کا تہذیبی رنگ اختیار کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر کفِ افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائے یہود[۹۴]

اسی طرح اقبال ظریفانہ انداز میں مغربی تہذیب کے سیاسی، تنظیمی اور فنی ادارہ جات کو اسلامی تہذیب سے الگ کرنے کی پرزور اپیل کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنے ادارہ جات کو مغربی ادارہ جات پر قربان کرنے سے پرہیز کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو مغربی ادارہ جات سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے[۹۵]

اس طرح اقبال مسلمانوں کو کمزوری اور پریشانی کے عالم میں بھی مغربی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی ہمت دیتے ہیں اور ان کے عیب و نقائص بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب میں داخل ہوئی کئی کمزوریوں کو بھی نہ صرف گنتے گئے بلکہ ان کی اصلاح اور طریقۂ اصلاح بھی واضح کرتے ہیں۔

حواشی

۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۱۱۱۔
۲۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، اقبال اور مغرب، آل احمد سرور (مرتب)، کشمیر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷، ص ۲۰۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۷
۴۔ ایضاً، ص ۲۰
۵۔ اقبال، کلیات اقبال (اُردو)، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۳۔
۶۔ ایضاً، ص ۳۰۳۔
۷۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مع مقدمہ، حواشی اور تصریحات از سید نذیر نیازی، نئی دہلی، اسلامک بک سینٹر، ص ۳۲۱-۳۲۲، ۱۳۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۹۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔
۱۰۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷، ص ۱۲۹۔
۱۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۶۵۷۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔
۱۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۲۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۲۔
۱۵۔ کلیات اقبال (اُردو) ص ۱۴۸۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۶۸۶۔
۱۸۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۲۳۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۶-۲۲۷۔
۲۰۔ محمد شریف بقا، خطباتِ اقبال: ایک جائزہ، پاکستان، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱، ص ۹۳۔
۲۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۱۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔
۲۳۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۶۵۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۰۷۔
۲۵۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۱۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۹-۲۰۰۔
۲۷۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۱۴۶۔
۲۸۔ ایضاً، ص ۳۹۱
۲۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ص ۱۸۹۔
۳۰۔ کلیات اقبال، ص ۶۱۱۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔
۳۲۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۶۵۰۔
۳۴۔ فکرِ اقبال، ص ۱۸۴۔
۳۵۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۶۴۹۔
۳۶۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۵۔
۳۷۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۱۶۰۔
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۴۷۔
۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۲۰۶۔
۴۱۔ کلیاتِ اقبال، ص ۱۶۰۔
۴۲۔ ایضاً، ص ۶۸۶۔
۴۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۹۰۔
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۷۵-۲۷۶۔
۴۵۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۳۹۹۔۴۰۰۔
۴۶۔ ایضاً، ص ۵۳۳۔
۴۷۔ ایضاً، ص ۵۵۴۔
۴۸۔ ایضاً، ص ۲۷۴۔
۴۹۔ ایضاً، ص ۵۹۹۔
۵۰۔ ایضاً، ص ۳۶۷۔

۵۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۴۰۔
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۵۶-۲۵۷۔
۵۳۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۴۱۰۔
۵۴۔ ایضاً، ص ۳۳۲۔
۵۵۔ ایضاً، ص ۶۳۷۔
۵۶۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۳۹۔
۵۷۔ کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۱۸۲۔
۵۸۔ ایضاً، ص ۶۰۴۔
۵۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔
۶۰۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ص ۱۴۱۔
۶۱۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۵۷۱۔
۶۲۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۱۔
۶۳۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۳۹۹۔
۶۴۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔
۶۵۔ ایضاً، ص ۵۳۲۔
۶۶۔ ایضاً، ص ۲۸۶۔
۶۷۔ ایضاً، ص ۳۱۶۔
۶۸۔ ایضاً، ص ۶۸۷۔
۶۹۔ ایضاً، ص ۵۱۶۔
۷۰۔ ایضاً، ص ۶۳۰۔
۷۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۱۔
۷۲۔ کلیات اقبال، ص ۲۶۷۔
۷۳۔ ایضاً، ص ۶۵۶۔
۷۴۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۵۲۰۔
۷۵۔ ایضاً، ص ۶۰۲۔
۷۶۔ ایضاً، ص ۶۲۲۔
۷۷۔ کلیات اقبال (اُردو)، ص ۴۵۹۔

۷۸۔ ایضاً،ص۲۶۴۔

۷۹۔ ایضاً،ص۴۹۰۔

۸۰۔ ایضاً۔

۸۱۔ ایضاً،ص۶۰۳۔

۸۲۔ کلیات اقبال (اُردو)،ص۶۰۸-۶۰۹۔

۸۳۔ کلیات اقبال (اُردو)،ص۶۱۶۔

۸۴۔ کلیات اقبال،ص۲۶۴۔

۸۵۔ کلیات اقبال،ص۳۴۳۔

۸۶۔ کلیات اقبال،ص۲۴۳۔

۸۷۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،ص۱۳۸۔

۸۸۔ ایضاً،ص۲۲۔

۸۹۔ کلیات اقبال،ص۲۶۵۔

۹۰۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،ص۲۷۴۔

۹۱۔ ایضاً،ص۲۳۳-۲۳۴۔

۹۲۔ کلیات اقبال،ص۵۲۷۔

۹۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،ص۲۱۹-۲۲۰۔

۹۴۔ کلیات اقبال ص۲۰۳۔

۹۵۔ ایضاً،ص۲۹۰۔

باب ششم

حاصل بحث

کیا تہذیبوں کے درمیان تصادم ہے؟

پچھلے صفحات پر گزری بحث اصل میں موجودہ زمانہ میں جاری جنگ و جدل اور مسلمانوں کی پراگندہ حالات کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔اس بحث میں موجودہ کشمکش اور ''تصادم'' کو اس کے منبع سے جوڑ کر دیکھنے کی سعی کی گئی ہے تا کہ ہم اس ''تصادم'' کی وجوہات اور بنیادوں کو جان سکیں۔ جہاں تک زیر بحث تہذیبی تصادم۔جس کو سموئیل نے پیش کیا ہے۔کا تعلق ہے تو یہ نظریہ پوری طرح سیاسی جہت رکھتا ہے اور امریکہ کے سیاسی مقاصد و مفادات کی نگہبانی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔افسوس کا مقام یہ ہے کہ ابھی یہ نظریہ پوری دنیا میں زیرِ بحث ہی ہے۔اکثر دانشور اور محققین اس کو بری طرح رد کر رہے ہیں۔کہ کچھ دانشوروں اور سیاسی تجزیہ نگاروں نے موجودہ سیاسی حالات کو اسی نظریہ کی دلیل قرار دیا ہے۔۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات اور اس کے بعد رونما ہوئے حالات اور کشیدگی کو نظریۂ تہذیبی تصادم کی تشریح اور تائید قرار دیا گیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔نہ تو ابھی ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات میں ملوث ہاتھوں کو پہچانا گیا ہے اور نہ اس کے پیچھے کام کرنے والے ذہنوں کو ہی دیکھا گیا ہے۔کئی ایسے سوالات سامنے آئے ہیں جو حل طلب ہے۔مثلاً اس روز ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) میں کام کرنے والے تقریباً چار ہزار اسرائیلی شہری اپنے اپنے کام پر کیوں نہیں گئے تھے؟ کیا ان کو پہلے ہی حملہ ہونے کی خبر تھی۔[1] غرض اس طرح کے کئی سوالات ہیں جو سلجھانے باقی ہیں اور بغیر دلیل ان حالات کو نظریہ

تہذیبی تصادم کی دلیل بتانا مضحکہ خیز اور عجیب نظر آتا ہے جو اس نظریہ کی سیاسی جہت پر دلالت کرتی ہے۔

یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ اصل میں موجودہ کشمکش صرف اسلام اور عیسائیت کے درمیان نہیں ہے، نہ یہ کشمکش محض مشرق و مغرب کے درمیان جاری ہے بلکہ یہ معاملہ مغرب جو عیسائیت کے ساتھ ساتھ یونانیت، رومیت وغیرہ پر مشتمل ہے اور اسلام کے درمیان ہے۔ مگر یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ تہذیبیں مہذب ہوتی ہے تو کیا مہذب تہذیبیں آپس میں متصادم ہو سکتی ہیں؟ مذہب تہذیبوں کی بنیاد ہے اور مذہب تصادم کے بجائے اتحاد اور سلامتی کی تعلیم دیتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان مذاہب کی بنیاد پر کھڑی ہونے والی تہذیبیں آپس میں متصادم ہو سکتی ہیں؟ تصادم کب اور کیوں ہوتا ہے؟ کیا تصادم قانونِ قدرت کے مطابق بے جا رونما ہوتا ہے یا پھر اس کو انسانی مداخلت یا عدم مساوات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے؟

تصادم خواہ مخواہ ممکن نہیں۔ تصادم کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور مخفی ہوتی ہے۔ فطرتاً ہر ایک چیز عدم تصادم کے اصول کے مطابق بنی ہوئی ہے اور تہذیبیں یا مذاہب ان اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ عموماً تصادم تب جنم لیتا ہے جب ایک ہی چیز کے دو طلب گار ہوں اور دونوں طالب اس چیز پر حق کا دعویٰ کرتے ہوں۔ کبھی کبھار کسی غلط فہمی کی بناء پر دو فریقین کے درمیان تصادم برپا ہوتا ہے۔ اول الذکر صورت میں تصادم کا ختم ہونا قطعاً ممکن نہیں جب تک نہ دو فریقوں میں سے ایک فریق اپنا دعویٰ واپس لے جبکہ آخر الذکر صورت میں غلط فہمی کا ازالہ ہونا تصادم کو ختم کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت روشن ہے کہ دونوں صورتوں میں تصادم بے جا نہیں بلکہ باوجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں مغرب اور اسلام کے درمیان جو "تصادم" سموئیل کے نظریہ کے مطابق برپا ہے وہ بے جا نہیں بلکہ باوجہ ہے۔ اور اگر بغور دیکھا جائے تو یہ تصادم نہیں بلکہ عمل اور ردِ عمل کی صورت ہے۔ مغرب اسلام پر تسلط کو مضبوط کرنا چاہتا ہے جبکہ اسلامی تہذیب اس تسلط کو ختم کرنے کے لئے برسرِ پیکار ہے۔

اسلامی تہذیب اجتہاد کی وجہ سے زندہ تہذیب ہے۔اور یہی عنصر اس تہذیب کو ترقی دیتا ہے۔اجتہاد اس تہذیب میں ایک ایسی لچک پیدا کرتا ہے جو مختلف ثقافتوں کو ایک روح (اسلامی روح) ہونے کی بنا پر قبول کرتا ہے۔غرض اجتہاد کی وجہ سے امریکی مسلم ثقافت، کشمیری مسلم ثقافت سے بالکل مختلف ہونے کے باوجود اسلامی تہذیب کے دو حصے ہیں کیونکہ دونوں ثقافتیں اپنے اپنے جغرافیائی حدود میں کئے گئے اجتہادات کی روشن دلیل ہے۔اور اسی اجتہاد کے چلتے ان کی اسلامی روح محفوظ رہ پاتی ہے۔

سموئیل کے مطابق مذہب تہذیبوں میں تصادم کی وجہ ہے مگر مذاہب کا جہاں تک تعلق ہے تو کوئی بھی مذہب بنیادی طور پر جنگ و جدل یا تصادم و معرکہ کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب اپنے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جنگ کو جائز قرار دیتے ہیں، مگر بے جا تصادم و معرکوں کے خلاف مذاہب بالکل واضح ہیں اور اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے اس کے مطابق تہذیب میں مذہب اور تمدن متصادم بھی ہے متجاذب بھی۔مذہب اور تمدن تب باہم حلیف ہوتے ہیں جب یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر سمجھے جائیں اور جب ان دو کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان میں ٹکراؤ ممکن ہے۔وہ مسیحیت میں اس کی مثال دیتے ہیں۔[۲] مسیحیت اپنی تہذیب سے کئی بار متصادم رہی کیونکہ وہ دنیوی امور سے فرار حاصل کر کے محض روحانی زندگی کے لئے سرمایہ کی جستجو میں تھیں جبکہ اسلام نے دنیوی اور روحانی زندگی کے درمیان توازن قائم کر کے اسلام کو دنیوی امور پر نافذ کر کے اس کو انسان کی روحانی ترقی کا سامان کر دیا۔

اقبال اقوام کی رقابت کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر یہ رقابت محض چشمک ہے جو فطرت سے جدا نہیں اور سموئیل کے نظریہ تصادم سے بالکل کوسوں دور ہے۔

حقیقتِ ازلی ہے رقابتِ اقوام
نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز، نہ تو![۳]

اقبال ایک اور جگہ اس رقابت کا تعلق وطنیت سے جوڑتے ہیں اور رقابتِ اقوام کو وطنیت یعنی وطن پرستی کی اُپج بتاتے ہیں۔ یہاں اقبال وطنیت کی خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور انہیں خامیوں میں رقابت کو بھی شمار کرتے ہیں۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے[۴]

یہ صحیح ہے کہ موجودہ دنیا اور مستقبل میں مذہب لوگوں کی توجہ کا مرکز رہے گا اور بقول سید محمد خاطمی۔ صدر اسلامی جمہوریہ ایران۔ "مستقبل پر مذہب کا حق ہے"۔[۵] مگر سموئیل کے مطابق تہذیب مستقبل کی سیاسی، اقتصادی حالات وغیرہ کے تعین میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔ مگر جہاں تک تاریخی حقائق کا تعلق ہے مذاہب تہذیبوں کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اور تہذیب مذاہب کی زندہ تصویر ہوتی ہے۔ اگر ہم نپولین کی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نپولین نے جب مصر پر قبضہ کیا تو وہاں موجود علماء اور مذہبِ اسلام کے بنیادی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے ظاہری طور پر اسلام کو قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ اپنے آپ کو بحیثیت مسلمانوں کا اور خصوصاً عثمانیوں کا دوست پیش کیا۔ اپنے لباس کو بدل کر مشرقی چغہ، دستار وغیرہ کا استعمال شروع کیا۔ ہر جمعہ مسجد جانے لگا۔ بسم اللہ سے اپنا خطبہ شروع کرنے لگا وغیرہ۔ اس طرح اس نے مذہب کی اہمیت اور مرکزیت کو سمجھ کر مصری ثقافت اور کلچر میں اپنے آپ کو فٹ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اسلامی تہذیب کے جزو لاینفک یعنی اسلام کو استعمال کر کے مصر پر اپنی سامراجی حکومت قائم کر سکے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں بھی مغرب مذہب کا استعمال کر کے مذہب کو ہی ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کے نام پر اسلام کی بیخ کنی کی جاتی ہے مگر یہ سب کچھ "تہذیبی تصادم" کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔

سموئیل کے مطابق دنیا کی سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں میں فرق نہ صرف حقیقی ہے بلکہ بنیادی بھی ہے اور چونکہ دنیا دن بدن چھوٹی جگہ بنتی جا رہی ہے اور مختلف تہذیبوں سے وابستہ افراد کے درمیان باہمی میل ملاپ (Interaction) زیادہ بڑھ رہا ہے اور ان مختلف

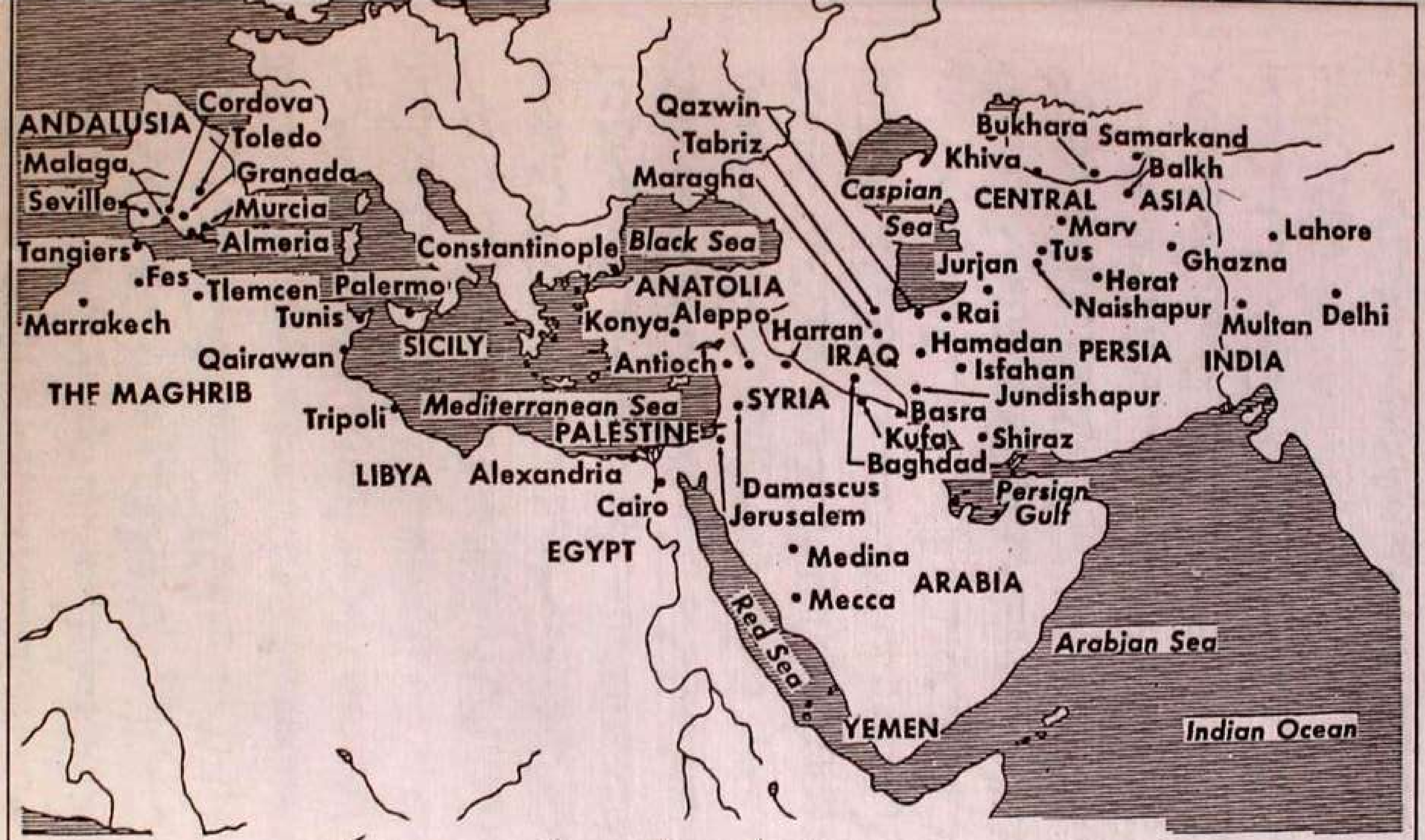

اسلامی علوم اور ثقافت کے چند اہم مراکز

[مقابل صفحہ نمبر ۱۳۶]

تہذیبوں سے وابستہ افراد اپنی اپنی تہذیب کے بارے میں زیادہ حساس ہوتے جارہے ہیں۔تہذیبوں کا فرق ان پر عیاں ہوجاتا ہے۔[6] اور یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے جس کی بنیاد پر بقول سموئیل ''تہذیبی تصادم'' برپا ہوجائے گا۔مگر تاریخی طور پر یہ دلیل غلط ہے اور مستقبل میں بھی یہ دلیل غلط ثابت ہوگی۔تہذیبوں کے فرق اور ان کے باہمی میل ملاپ نے اکثر دفعہ تہذیبوں میں نظریات، خیالات اور علوم کی ترقی اور Cross-fertilization کو جگہ دی ہے۔[7] اگر ہم ہندوستان کی طرف نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے یہاں نئی ثقافت و کلچر کو پروان چڑھایا۔ہندوستان کی ہندو تہذیب اور مسلمانوں کی مسلم تہذیب نے نئی صحت مند ثقافت کی بنیاد ڈالی۔اُردو جیسی میٹھی زبان کو وجود بخشا، ہندوستان میں مسلمانوں نے کاغذ، کپڑے وغیرہ کی صنعت کو فروغ دیا۔کشمیر میں اسلام کی آمد تاج وتخت سے بالکل دور علماءِ کرام کے ذریعہ ممکن ہوئی۔شاہِ ہمدان رحمتہ اللہ علیہ اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کو بھی ساتھ لائے جس سے کشمیر کی ہندو ثقافت اور وسطِ ایشیا کی اسلامی ثقافت نے آپس میں لین دین کو ہموار کیا اور نئی کشمیری مسلم ثقافت نے دنیا میں آنکھ کھولی اور ''تصادم'' کے بجائے نئے کلچر نے جنم لیا۔اگرچہ اس لین دین میں اسلامی تہذیب کی بعض ثقافتیں کئی لحاظ سے ملاوٹ اور مضر اثرات کی شکار ہوئیں مگر اس کے باوجود ''تصادم'' برپا نہ ہوا۔حکمائے اسلام یونانی فلسفہ کے زیر اثر تھے۔[8] اور کچھ نے اس فلسفہ کا رد بھی کیا مگر اسلامی تہذیب ہمیشہ تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرتی گئی۔پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ موجودہ دور میں بڑھتے میل ملاپ کی وجہ سے ''تہذیبی تصادم'' کا خطرہ ہے۔

بے شک اسلام کی بنیاد توحید ہے اور اسلامی تہذیب کی بنا اسلام پر ہی رکھی گئی ہے۔[9] جو اتحادِ عالم کی ضمانت ہے۔اقبال اسی نظریہ کے قائل تھے۔وہ انسانی اقدار کی عالم گیر وحدت کے وکیل تھے۔وہ دنیا کو منقسم نہیں بلکہ متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ایک ریڈیائی تقریر میں اقبال نے کہا تھا:

> ''اس زمانے میں۔۔۔دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہورہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال

نہیں پیش کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے، وہ خون ریزیں اور سفاکی اور زبردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا، صرف اس واسطے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا، پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خون ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش رہیں اور استعمار کی جوں چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے"۔[10]

اس تقریر میں واضح طور پر موجودہ سیاسی صورت حال نمایاں ہے اور اقبال آج سے کئی دہائی قبل ان حالات کا نقشہ کھینچ رہے ہیں جو حالات اس وقت دنیا میں واقع ہو رہے ہیں۔ وہ اقوام کے تسلط کی بات کرتے ہیں اور اقوام کی ہوس کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ غرض اقبال ناقدانہ نگاہ سے حالات کو جانچ رہے تھے اور ان کی پس پردہ خباثت سے دنیا کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کی وحدت کے قائل تھے نہ کہ تہذیبوں کے تصادم کے۔ وہ اسی تقریر میں آگے فرماتے ہیں:

"وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ[11] کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے"۔[12]

ان الفاظ میں واضح ثبوت ملتا ہے کہ اقبال تہذیبوں کے بٹوارے کے بجائے اتحاد

بنی نوع انسان کے قائل تھے، وہ گروہوں اور فرقوں میں نوع انسانی کے منقسم ہونے میں اخوت، حریت اور مساوات کے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے، وہ نام نہاد جمہوریت، قوم پرستی اور ملوکیت کو لعنت تصور کرتے تھے اور ان کو مٹانے اور ختم کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ اتحادِ عالم کے علمبردار ہیں اور اسی کو دنیا میں انسان کی فلاح وسعادت کا ضامن تصور کرتے ہیں۔

مغرب اسلام کو محض ایک رسم کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ اس کو پوری زندگی سے بے دخل کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح اسلام کو موجودہ عملی دنیا میں ناکام ثابت کیا جائے۔ وہ اسلام کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے ظاہری عبادات تک محدود کرنا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان اس نظریہ کو قبول نہیں کرتے اور مغرب کی اس تعبیر کو نہ صرف ناپسند کرتے ہیں بلکہ وہ اس کا سخت الفاظ میں رد بھی کرتے ہیں۔ مسلم اسلام کو واحد، مکمل اور برحق نظام حیات مانتے ہیں۔ وہ موجودہ مسائل کے حل کو اسلام میں مضمر مانتے ہیں۔ وہ اسلام کو ہر مسئلہ اور ہر درجہ پر قابلِ نافذ مانتے ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام اب نہ صرف عیسائی مذہب کا مدمقابل ٹھہرتا ہے بلکہ یہ پورے مغربی نظام اور مغربی تہذیب کو چیلنج کرتا ہے۔ اور جب مغرب اس مکمل اور برحق نظام پر اپنا تسلط جمانے کی پرزور کوششیں کرتا ہے تو نتیجتاً اسلامی تہذیب ردعمل کے بطور اس تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے جو ایک مسلسل اور مستحکم کشمکش اور ٹکراؤ کو جنم دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ کشمکش قدرتی نہیں بلکہ مغربی تسلط کے خلاف اسلامی ردعمل کی صورت ہوتی ہے۔

موجودہ دنیا میں اس جنگ وجدل کی جڑ پوری طرح تاریخ میں پیوست ہے۔ اسلامی تہذیب روزِ اول سے ہی مغربی تہذیب یا اس کے بنیادی عناصر کے نشانہ پر رہی ہے۔ رومی سلطنت کے بعد صلیبی جنگوں نے اسلامی تہذیب کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہر وقت اسلامی تہذیب نے اپنا دفاع بخوبی انجام دیا اور اپنے تحفظ کو یقینی بنایا۔ ترکی یورپ کے قریب رہنے کے باوجود یورپ میں شمار نہیں کی جاتی کیونکہ تاریخی طور پر ترکی مسلم ریاست ہے۔ اگرچہ ترکی کی خارجہ پالیسی میں یورپی مفادات عیاں ہیں مگر یورپ اس کے

ماضی کی وجہ سے اس کو یورپ دوست تصور نہیں کرتا ہے۔ اقبال بھی اسی سوچ کے قائل ہیں۔

غرض اسلام کا دنیا میں پھر سے قابل نافذ ہونا مغرب کی آنکھ میں کھٹکتا ہے اور اسی لئے وہ اسلام کو مغرب کے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی شبیہ کو ہر قیمت پر بگاڑنا چاہتے ہیں۔ کمیونزم نے مغربی ادارہ جات کو ناکام ثابت کرنے کی کوشش کی اور مغرب نے کمیونزم کو سب سے بڑا خطرہ شمار کیا اسی طرح اسلام روزِ اول سے ہی مغربی ادارہ جات کے نقائص کو بے نقاب کر رہا ہے اور کمیونزم کے بعد اسلام کو ہی مغرب نے اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ گننا شروع کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں انقلاب برپا ہوا۔ اگر چہ یہ انقلاب ایران کی جغرافیائی حدود تک محدود رکھوایا گیا مگر اس کے باوجود مغرب نے اس کو مسلمانوں کی بیداری کا نقیب سمجھ کر اپنے میڈیا کے ذریعہ اس کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل نے مغرب کو دوبارہ اپنی پالیسی پر سوچنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ ان دو واقعات نے مغرب پر یہ حقیقت عیاں کی تھی کہ مشرق ابھی اتنا سیکولر نہیں ہوا تھا جتنا انہوں نے اس کو سیکولر بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے پہلی خلیجی جنگ (۱۹۹۱ء) کے بعد نیو ورلڈ آرڈر کے نام کے تحت مسلمان ممالک کو پھر ایک مرتبہ کمزور کرنے کی عملی کوششیں شروع کی گئی۔ اس لحاظ سے اسلام مغرب کے لئے خطرہ نہیں بلکہ مغرب اسلام کے لئے خطرہ بنتا گیا۔

سموئیل کے مطابق بین الاقوامی نظام[۱۳] جو تہذیبوں پر مبنی ہوگا مستقبل کی سلامتی کا محافظ ہوگا۔ مگر مسلمانوں کے خیال میں یہ بین الاقوامی نظام جو نیو ورلڈ آرڈر (New World Order) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مستقبل کی سلامتی اور حفاظت کے لئے خطرہ ہے اور اسی لئے ہمیں موجودہ دنیا میں ایک مسلسل کشمکش اور جدوجہد نظر آتی ہے کیونکہ یہ عملاً بالکل ناممکن ہے کہ دنیا کے تمام ممالک امریکی نظام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں۔ لوک روایات اور مذاہب کے اثر کو معدوم کرنا گویا حقیقت کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہے اور ان تمام عناصر کو یکسر نظر انداز کر کے امریکی بین الاقوامی نظام کی وکالت

کرنا گویا اس جنگ کا بگل بجانا ہے۔ اگر کوئی تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے تو اس تہذیب سے وابستہ ثقافتیں عمر دراز تک لوگوں سے جڑی رہتی ہے۔ چونکہ اسلامی تہذیب اس وقت زوال کی شکار ہے مگر اسلامی ثقافتیں ابھی بھی اپنے اپنے جغرافیائی حدود میں زندہ ہیں۔ مسلمانوں کی زندگی بتدریج مغربی تہذیب کے اثر میں لائی جارہی ہے مگر اس تہذیب میں ہماری موجودہ ثقافتیں پوری طرح فٹ نہیں بیٹھتی اور عقل یہ مطالبہ کرتی ہے کہ یا تو ثقافتوں کو بدل دیا جائے یا پھر ان ثقافتوں کی اصلی تہذیب - اسلامی تہذیب - کو ہی پھر سے زندہ کیا جائے۔ چونکہ ثقافت کو بدلنا دین کو بدلنا ہے اور اسلامی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنا اسلام کو تقویت پہنچانا ہے۔ اس لئے اہلِ مشرق مغربی تہذیب کے اثر کو روکنے کے لئے جو راہِ عمل اختیار کرتے ہیں وہ اسلام کے دفاع کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو بعد میں مذاہب کے ''تصادم'' کے بطور دنیا کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور جو اصل میں تصادم نہیں بلکہ تسلط و آزادی کے درمیان ایک معرکہ ہے۔

اقبال روزِ اول سے ہی مغربی آزادی، جمہوریت کو غلامی تصور کرتے تھے۔ وہ اس آزادی کو مشرق کے لئے خطرہ اور غلامی مانتے ہیں۔ موجودہ دور میں مغرب کی طرف سے مسلم ممالک پر آئے دن جو حملے ہورہے ہیں وہ اقبال کے خیال کو صحیح ثابت کررہے ہیں۔ عراق پر حملہ کرنے کے بعد وہاں مغربی طاقتوں نے پوری طرح تسلط جمایا۔ اور اس حملہ کا مقصد وہاں کے لوگوں کو ''آزادی'' مہیا کرنا بتایا گیا۔ مگر حال ہی میں امریکی اور یورپی افواج کی طرف سے وہاں کیا گیا ظلم وستم اس کی قلعی کھولتے ہیں۔ ابوغریب جیل کے سکنڈل نے مغربی دعووں کو کھوکھلا ثابت کیا ہے اور اس سے مغربی جمہوریت اور آزادی کی اصلیت واضح ہوئی

تو نے دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر[۱۴]

جہاں تک مغرب سے استفادہ کا تعلق ہے تو علامہ سید رشید رضا کا نظریہ بھی اس

سلسلہ میں صحیح نظر آتا ہے:

''جو کچھ ہمیں یورپ [مغرب] سے لے لینا چاہیے وہ اس کا سائنسی علم، تکنیکی ہنرمندی اور اعلیٰ صنعتیں ہیں۔ ان پہلوؤں کا حصول مغربیت کے حصول کو ضروری نہیں بناتا ہے''[۱۵]

اگر بغور دیکھا جائے تو مغرب نے ہر وقت اسلامی ممالک کے خلاف دوہرا معیار اختیار کیا ہے جب کوئی مسلم ملک کوئی ''غلطی'' کرتا ہے تو امریکہ اس کے خلاف کاروائی کرتا ہے مگر جب کوئی غیر مسلم ملک یہی حرکت کرتا ہے تو امریکہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ جب عراق نے ۱۹۹۱ء میں کویت پر قبضہ کیا تو امریکہ نے اس کے خلاف جنگ شروع کردی مگر جب اسرائیل نے لبنان پر قبضہ کیا تو اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ تقریباً چالیس ہزار لوگ اسرائیل کی فوجی کاروائی میں مارے گئے جب اس نے لبنان پر قبضہ جمایا تھا۔

عراق نے اقوام متحدہ کی اس قرارداد کو مسترد کیا جس کے مطابق اس کو کویت سے جلد از جلد نکلنا تھا مگر اسرائیل نے لگاتار ۱۸ سال تک اس جیسی ایک اور قرارداد کو مسترد کیا جو قرارداد اسرائیل کو لبنان سے نکلنے کی تاکید کررہی تھی۔

عراق نے اقوام متحدہ کے معینہ کاروں کو مسترد کیا تو اس کے خلاف اس ''جرم'' کی سزا کے بطور جنگ شروع کی گئی جبکہ اسرائیل آج تک اقوام متحدہ کے معینہ کاروں کو اسرائیل میں داخل نہیں ہونے دے رہا ہے۔ اس طرح کی دوہری خارجہ پالیسی نے مسلمانوں کے ردعمل کو جواز بخشا ہے اور پورے عالم اسلام کو مغرب کے خلاف کھڑا کیا ہے۔

سموئیل کے ''تہذیبی تصادم'' کو اگر ''جنگ برائے مفادات'' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ مغرب نے ہر وقت یہ کوشش کی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے مفادات کو تحفظ بخشے اور اپنے اقتصادی مفادات کو ترقی دے سکے۔ افغانستان پر کیا گیا حملہ امریکہ کی نظر میں ۱۹۹۱ء سے ہی تھا۔ وہ اس حملہ کی تیاری میں دس سال سے مصروف اور محوِ فکر تھا۔ اس کی اصل وجہ وسطِ ایشیا میں تیل کے ذخائر کی موجودگی تھی۔ چونکہ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین ٹوٹ چکا تھا

اور کزاکستان کے ساحلی علاقوں میں تیل کے بڑے بڑے ذخائر دریافت کئے گئے تھے۔ اس لئے ان ذخائر کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا کیونکہ افغانستان کا راستہ امریکی تیل کمپنی Unocal کے مطابق بالکل صحیح اور فائدہ مند تھا۔ اسی طرح عراق کو حاصل کرنے کے بعد امریکہ عرب کے تیل کے ذخائر کا زیادہ محتاج نہیں رہے گا۔ مگر سموئیل اور امریکہ ان مفادات اور مقاصد کو الگ کر کے صرف ''تصادم'' کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں۔ کیونکہ ہر ایک ''تصادم'' کی کچھ بنیادی وجوہات ہوتی ہیں اور ہر ایک جھگڑے کی اصل ماضی میں مدفون ہوتی ہے اور کسی جگڑے یا تصادم کی بنیادی وجہ کو مستقبل میں تلاش کرنا نادانی ہے۔ اسی لئے Edward W. Said نے سموئیل کے ''نظریہ تہذیبی تصادم'' کو سرد جنگ کو اسلامی، کنفیوشنی اور مغربی ممالک کے باہمی ''تصادم برائے بالادستی'' سے بدلنے کی کوشش کہا ہے۔[16]

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ایسا شخص جس نے مغربی مفادات کو نقصان پہنچایا ہے یا جس نے کسی مسلم قوم کے حق میں خدمت کی ہو وہ شخص تاریخ میں دو جہتیں رکھتا ہے۔ مسلم قوم اس کو عظیم مانتے ہیں جبکہ غیر مسلم اور مغربی قوم اس کو ذلیل شمار کرتی ہیں۔ سلطان عبدالحمید دوم، اورنگ زیب، ٹیپو سلطان، سلطان سکندر (کشمیر) کشمیری حریت پسند، افغانی (طالبان)، اسامہ، ملا عمر وغیرہ اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فرقہ ان کو مجاہدین اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے والا مانتا ہے۔ جبکہ دوسرا فرقہ ان کو دہشت گرد اور ظالم کہتا ہے۔ جو واضح طور پر مغرب کے مفادات کی حفاظت یا عدم حفاظت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ''مسلم دہشت گردی'' (Islamic Terrorism) کی اصطلاح کا استعمال کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ مسئلہ تہذیبوں کا نہیں مذہبوں کا ہے جس میں مختلف تہذیبوں کے مفادات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

امریکہ موجودہ دور میں اپنے آپ کو مذہب عیسائیت کا واحد ترجمان اور محافظ سمجھتا ہے اور اس لئے وہ ہر طرف اور ہر درجہ پر عیسائی مذہب کو حفاظت دینے کے لئے دوسرے

مذہبوں کی پہچان کو مسخ کر رہا ہے۔ جہاں مسلم مجاہدین کو "مسلم دہشت گرد" کہا جاتا ہے وہیں عیسائی Serb اور Croat کو ان کے مذہب عیسوئی سے الگ کر کے دیکھا اور دکھایا گیا تاکہ ان کی دہشت گردی سے کہیں عیسائی مذہب کی پہچان مسخ نہ ہو سکے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس دوہری پالیسی اور حفاظتِ عیسائیت پر اس طرح امریکہ کے کردار کی طرف انگشت نمائی کی ہے:

"یہ بات ۔۔۔ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس وقت امریکہ اپنے آپ کو عیسائیت کا واحد محافظ سمجھتا ہے۔ امریکہ میں ہارورڈ [جس سے سموئیل تعلق رکھتا ہے]، تنگ نظروں اور Conservatives کا سب سے معروف اڈا کہا جا سکتا ہے۔ امریکی اقتدار کی ترجمانی اور مدافعت ہمارے زمانے میں وہ لوگ کر رہے ہیں جو ذہنی اعتبار سے انتہائی جارحیت پسند، متعصب بلکہ Fanatic کہے جا سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عصرِ حاضر کی عیسائی تہذیب اور اقدار و اسالیب (جنہیں بعض مورخین مثلاً توا ین بی، انسان کے اجتماعی سفر کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز سمجھتے ہیں) یوروپ کے ملکوں اور حکومتوں نے ان کے حقوق ادا نہیں کیے۔ اب تاریخ نے یہ الوہی فریضہ امریکہ کی موجودہ حکومت کے سپرد کر دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کو ہر حال میں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ جو ذمہ داری یوروپ کے تمام ممالک مل کر نہیں نبھا سکے، امریکہ اسے یکہ و تنہا نبھانے پر کمر بستہ ہے۔ احیا جماعتیں اسی طرح کے خواب دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اور ایک جذباتی جوش اور ولولہ انہیں جارحیت کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ امریکہ کی حکمران جماعت خود کو ایک محدود نصب العین کی محافظ سمجھ بیٹھی ہے اور جی جان سے اپنا خواب پورا کرنے میں جٹ گئی ہے۔ اس 'مقدس فریضے' کی تکمیل کے لئے دوسرے ممالک جو بھی قیمت ادا کریں کم ہے"۔[۱۷]

مغرب اس وقت پوری طرح مشرق پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں اور ہر اس صورت کو کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اسلامی تہذیب میں تقویت اور طاقت فراہم کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف ان ممالک کی ایک فوج تیار کی جا رہی

ہے جو غیر مغربی ہو کر مغربی مفادات کو مسلمانوں سے محفوظ رکھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ مثلاً اسرائیل اور بھارت کی ہر لحاظ سے امداد کی جاتی ہے تا کہ یہ دو ممالک اپنے اپنے علاقوں میں بالادستی قائم کریں اور ان علاقوں۔ مشرق وسطیٰ اور ایشیا۔ میں مسلم ممالک مغربی ممالک کے لئے کوئی مشکل پیدا نہ کر سکیں۔ اسی ہوا کے چلتے بھارت کے سابقہ وزیر اعلیٰ اٹل بہاری واجپائی نے ۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء کو اپنے ایک بیان میں صاف کہا کہ ''اسلام کے دو چہرے ہیں ایک وہ جو برداشت کی تعلیم دیتا ہے اور انسانی جذبات کی قدر کرتا ہے اور دوسرا وہ جو دہشت گردی کو ہوا دیتا ہے اور وہ برداشت کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں رکھتا۔ انڈونیشا، ملیشیا جہاں کہیں بھی مسلمان رہ رہے ہیں وہ مل کر رہنا نہیں چاہتے ہیں وہ گل مل کر نہیں رہتے، وہ امن کے ساتھ رہنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔''[18] جب Time میگزین کے نمائندہ نے پروین توگڑیا سے یہ سوال کیا کہ وہ مسلمانوں سے کیوں پریشان رہتے ہیں؟ تو اسکے جواب میں اس نے کہا کہ اصل میں یہ اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف ثقافتی تصادم ہے۔[19]

غرض مغرب ہر ایک ملک کو اپنے مفادات کی عینک پہن کر دیکھ رہا ہے اور ہر ایک غیر مسلم ملک کو اپنے فائدہ کے لئے اسلامی تہذیب کے خلاف اُکساتا ہے۔ تا کہ اس کی بالادستی اور تسلط برقرار رہ سکے۔ جہاں کہیں مسلمانوں میں کوئی دوررس اور باصلاحیت قیادت نظر آتی ہے وہاں CIA یا MOSSAD کے ذریعہ اس کو قتل کروایا جاتا ہے تا کہ اسلامی دنیا میں مضبوط قیادت کا فقدان جاری رہے۔ اور مغربی میڈیا مسلمانوں کی اصل قیادت کو ہمیشہ نظر انداز کر کے مسلم فلمی اداکاروں اور مسلم ادباء کو بطور مسلمانوں کی پہچان پیش کرتے ہیں۔

مختصراً یہ سب مغربی ہتھکنڈے اسلامی تہذیب سے وابستہ افراد کو ردعمل کے طور پر مغربی تہذیب کے مقابلے میں لاتے ہیں جس کی بنیاد مغربی ہوس اور تسلط میں پنہاں ہے اور اسی ردعمل کو سموئیل ''تہذیبی تصادم'' کہہ کر مغرب کیلئے مسلم کشی اور اسلام دشمنی کی راہ کو جائز قرار دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر مغرب کو جاننا چاہیے کہ اسلامی تہذیب ایک تابناک

اور عظیم تہذیب ہے اور اس کی بقا خود مغربی تہذیب میں مثبت اضافہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے Niels Helveg Petersen نے کہا ہے:

''مغرب اسلامی تحریکات سے بڑی حد تک سبق سیکھ سکتا ہے۔ اسلامی تحریکات مادی دولت کے بجائے روحانیت اور مضبوط معاشرتی احساس (Social Conscience) کو اپنا ہدفِ نظر بناتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرتی احساس جو صرف انکم ٹیکس فارم پر ظاہر نہیں ہوتا ہے بلکہ جو ایک فرد میں معاشرے کے کسی مفلوک الحال فرد سے ٹھوس اتحاد پیدا کرتا ہے''۔[20]

ضرورت اس امر کی ہے کہ مغرب قرآن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تسلط اور تصادم کے بجائے گفت وشنید کی راہ اختیار کرے تا کہ پوری انسانیت اس کے مزید فساد اور ظلم سے محفوظ رہ سکے۔

﴿قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سوآء بیننا و بینکم ألا نعبد الااللّٰه ولا نشرك به شیئًا ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابًا من دون اللّٰه فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون﴾[21]

''کہو [اے محمد ﷺ] اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بنائے۔ اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو کہدو گواہ رہو ہم مسلم ہیں''۔

حواشی

1. P.K. Niyaz, *Operation Enduring Freedom or Global Supremacy*, Ed. F.R. Faridi, New Delhi, M.M.I, n.d. p.p. 121-123.

۲۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۲-۱۴۔

۳۔ کلیات اقبال، ص ۶۲۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔

5. Syed Mohammad Khatami, *Islam, Dialogue and Civil Society*, N.Delhi, JNU., 2003, p. 42.

6. Samuel, P. Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs*, Summer 1993.

7. Syed Arif Hussain, "The Clash of Civilizations and questionable Thesis", *Operation Enduring Freedom or Global Supremacy*, Ed. Dr. F.R. Faridi, p 196.

۸۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۴۳۔

9. Isma'il R. al Faruqi et al, *The Cultural Atlas of Islam*, N. York Macmillian Publishing Company, 1986, p. 73.

۱۰۔ بحوالہ ''تہذیب کے تصادم کا مسئلہ اور اقبال''، پروفیسر شمیم حنفی، ایوانِ اردو دہلی، اپریل ۲۰۰۳۔

۱۱۔ یہ الفاظ ایک بہت ہی کمزور (ضعیف جدا) روایت سے لئے گئے ہیں۔ اس روایت کے مکمل الفاظ یوں ہیں۔ ''الخلق کلهم عيال الله، فاحبهم الى الله انفعهم لعياله) ۔ (عن انس و عن ابن مسعود مسند ابی یعلی والطبرانی فی الکبیر) ملاحظہ ہو سلسلة الاحاديث الضعيفه والموضوعة للالبانی، ح ۳۵۹۰۔

۱۲۔ بحوالہ ''تہذیب کے تصادم کا مسئلہ اور اقبال''، پروفیسر شمیم حنفی، ایوانِ اُردو، دہلی، اپریل ۲۰۰۳ء۔

13. S.P. Huntington, *The Clash of Civilizations*, P 321.

۱۴۔ کلیاتِ اقبال، ص ۶۵۰۔

15. Emad Eldin Shahin, *M. Rashid Rida and the West*, USA, IIIT, 1994, p. 49.

16. Edward W. Said, *Peace and Its Discontents*, N. York, Vintage Books, 1996, p. 86.

۱۷۔ ''تہذیبوں کے تصادم کا مسئلہ اور اقبال''، ایوانِ اُردو، دہلی، اپریل ۲۰۰۳ء۔

18. Daily *Greater Kashmir*, Srinagar, 13 April, 2003.

19. *Time*, April 8, 2002.

20. Niels Helveg Peterson, "The Muslim World and the West--- a Need for Dialogue" *Islam in a Chaing World*, ed. A Jerichow et al, Great Britain, Biddles Ltd, 1997, p. 175.

۲۱۔ القرآن، ۳:۶۴۔

ماخذ

اہم اردو/عربی کتب

۱۔ القرآن الحکیم

۲۔ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مع مقدمہ، حواشی اور تصریحات از سید نذیر نیازی، نئی دہلی، اسلامک بک سینٹر، ۱۹۸۶ء۔

۳۔ اقبال، کلیات اقبال (اُردو)، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵۔

۴۔ الالبانی، محمد ناصر الدین۔ سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة۔ الریاض، مکتبة المعارف، ۱۹۸۸ء۔

۵۔ الالبانی، محمد ناصر الدین۔ صحیح الجامع الصغیر و زیادة۔ بیروت، المکتبة الاسلامی، ۱۹۸۸ء۔

۶۔ الالبانی، محمد ناصر الدین۔ ضعیف الجامع الصغیر و زیادة۔ بیروت، المکتبة الاسلامی، ۱۹۹۰ء۔

۷۔ الحکیم، خلیفہ عبد (ڈاکٹر)۔ فکرِ اقبال۔ علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷ء۔

۸۔ القرضاوی، یوسف۔ امریکہ کا دینی تعلیم میں تبدیلی کا مطالبہ کیوں؟۔ مترجم: ابوسعد، دہلی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء۔

۹۔ برٹ، ایڈون اے۔ فلسفۂ مذہب۔ مترجم: بشیر احمد ڈار، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔

۱۰۔ بقا، محمد شریف۔ خطباتِ اقبال: ایک جائزہ۔ پاکستان، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۱۱۔ تیمیہ، ابن (علامہ)۔ اسلام اور غیر اسلامی تہذیب۔ مترجم: مولوی شمس تبریز خان، لکھنؤ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔

۱۲۔ جالبی، جمیل (ڈاکٹر)۔ قومی انگریزی اُردو لغت۔ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔

۱۳۔ خان، محمد یحییٰ (مترجم)۔ یہودی پروٹوکولز۔ نئی دہلی، ملی پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

۱۴۔ خلدون، عبدالرحمن ابن (علامہ)۔ مقدمہ ابن خلدون۔ دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷ء۔

۱۵۔ شہید، سید قطب۔ جادہ ومنزل۔ مترجم: خلیل احمد حامدی، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۰ء۔

۱۶۔ ضناوی، محمد علی (ڈاکٹر)۔ اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید۔ دہلی، ہندوستان پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء۔
۱۷۔ عالم، اسرار۔ عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال۔ دہلی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۹۹۶ء۔
۱۸۔ فاروقی، شجاع الدین (ڈاکٹر)۔ معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال۔ دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۹ء۔
۱۹۔ فریدی، فضل الرحمن (ڈاکٹر)۔ گلوبلائزیشن اور اس کے معاشی وثقافتی اثرات۔ نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۱ء۔
۲۰۔ کاشمیری، حامدی (ڈاکٹر)۔ اقبال اور مغرب۔ آل احمد سرور (مرتب)، کشمیر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء۔
۲۱۔ معید الظفر۔ عیسائیت اور تثلیث۔ کشمیر، علامہ ابن تیمیہ ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۲ء۔
۲۲۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی۔ دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۷۷ء۔
۲۳۔ ندوی، ابوالحسن علی (مولانا)۔ اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین۔ لکھنؤ، مجلس تحقیقات ونشریات، اسلام، ۱۹۸۲ء۔
۲۴۔ ندوی، ابوالحسن علی (مولانا)۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔
۲۵۔ ندوی، سید ابوالحسن علی (مولانا)۔ عالم عربی کا المیہ۔ لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۸۰ء۔
۲۶۔ ندوی، ابوالحسن علی (مولانا)۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۹۵ء۔
۲۷۔ ندوی، ابوالحسن علی (مولانا)۔ مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں۔ لکھنؤ، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۸۱ء۔

اهم انگریزی کتب

1. al Faruqi, Isma'il R. et al, *The Cultural Atlas of Islam.* N. York, Macmillian Publishing Company, 1986.
2. Ali, Ameer. *The Spirit of Islam.* Delhi, Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, 1978.
3. Ali, Syed Amir. *A Short History of Saracens.* N. Delhi, Kitab Bhawan, 1994.
4. Ali, Zulfikar. *"If I am Assassinated...".* N. Delhi, Vikas Publishing House, 1979.
5. Chomsky, Noam. *World Orders, Old and New.* N. Delhi, Oxford University Press, 2003.
6. *Encyclopaedia Britannica.* Chicago, Encyclopaedia Britannica Ltd., 1951/1975/1988/1992.
7. Feroze, Muhammad Rashid. *Islam and Secularism in Post-Kemalist Turkey.* Pakistan, Islamic Research Institute, 1976.
8. Ford, Henry. *The International Jew.* Karachi Pakistan, Umma Publishing House, 1970.
9. Gove, Philip Babcock (ed.) et al. *Webster's Third New International Dictionary.* 1965.
10. Grant, Michael. *The Fall of the Roman Empire.* London, Weidenfeld & Nicolson, 1990.
11. Grover, Verinder (ed.). *Encyclopaedia of International Terrorism.* N. Delhi, Deep and Deep Publications, 2002.
12. Hasting, James (ed.). *Encyclopaedia of Religion and Ethics.* N. York, T.&T. Clark, 1935.
13. Hiro, Dilip. *War without End.* New Delhi, Rotledge, 2002.

14. Huntington , Samuel P. *The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order.* Delhi, Penguin Books 1997.
15. Iqbal, Sheikh Mohammad. *Palestine - Re-Emerging.* Kashmir, S.N.A. and Bros. 2002.
16. Jameelah, Maryam. *Islam and Western Society. N. Delhi, Adam Publishers and Distributors, 1982.*
17. Jameelah, Maryam. *Islam in Theory and Practice.* Delhi, Taj Company, 1997.
18. Jameelah, Maryam. *Islam Versus the West.* N. Delhi, Markazi Maktaba Islami, 2002.
19. Jerichow, A. et al (ed.). *Islam in a Chaing World.* Great Britain, Biddles Ltd, 1997.
20. Khatami, Syed Mohammad. *Islam, Dialogue and Civil Society.* N.Delhi, JNU., 2003.
21. Lichtenstadter, Ilse. *Islam and Modrn Age.* Delhi, Muslim Academy, 1982.
22. Marsden, Victor E.(tr.). *World Conqeust Through World Government.* N.Delhi, Milli Publications, 2003.
23 Muradpuri, Muhammad Akbar. *Conflict Between Socialism and Islam.* Lahore, Islamic Publications, 1970.
24. Mutahhary, Murtaza. *Islamic Movements in Twentieth Century.* N. Delhi, Iran Culture House, n.d.
25. Nasr, Seyyed Hossein. *Science and Civilization in Islam.* Malaysia, Dewan Pustaka Fajar, 1984.
26. *New Webster's Dictionary of the English Language,* Deluxe Encyclopaedic Edition, USA, Delair Publishing Company, 1971.
27. Picthal, M.M. *Cultural Side of Islam.* Delhi, Kitab Bhawan, 1990, p.2.

28. Russell, Bertrand. *Why I am Not a Christian.* London, Routledge, 2000.
29. Said, Edward W. *Culture and Imperialism.* New York, Vintage Books, 1994.
30. Said, Edward W. *Orientalism.* England, Penguin Books, 1995.
31. Said, Edward W. *Peace and Its Discontents.* N. York, Vintage Books, 1996.
32. Said, Edward W. *The Politics of Dispossession.* USA, Vintage, 1994.
33. Sardar, Ziauddin. *The Future of Muslim Civilization.* London, Mansell Publishing Limited, 1987.
34. Shahin, Emad Eldin. *M. Rashid Rida and the West.* USA, IIIT, 1994.
35. Siddiqi, Mazheruddin. *Modern Reformist Thought in the Muslim World.* Delhi, Adam Publishers and Distributors, 1993.
36. Stein, Harvey Waller. *The Penguin Dictionary of Psychology.* Britain, Penguin Books, 1982.
37. Teed, Peter. *The Oxford Dictionary of 20th Century History--1914-1990.* New York, Oxford University Press, 1992.
38. *The Encyclopedia Americana.* Grolier incorporated, USA, 1991.
39. *The Oxford Encyclopaedic Dictionary.* London, Oxford University Press, 1983.
40. *The Oxford English Dictionary.* Oxford, The Clarendon Press, 1933.
41. Tibi, Bassam. *Arab Nationalism- A Critical Enquiry.* New York, St. Martin Press, 1991.
42. Tomlin, E.W.F. (ed.). *Arnold Toynbee- A Selection*

from his Works. London, Oxford University Press, 1978.

43. Vonlaue, Theodre H. *The World Revolution of Westernization*. New York, Oxford University Press, 1987.
44. Will & Ariel Durant. *The Story of Civlization: Our Oriental Heritage*.

اہم رسائل و جرائد

۱۔ ایوانِ اردو دہلی، اپریل ۲۰۰۳۔

2. Hoge, James F. (jr.). *Foreign Affairs*. Summer 1993.
3. Kaloo, Fayaz Ahmad. *Daily Greater Kashmir*. Srinagar, 13 April, 2003.
4. Mahadevan, Ashok. *Reader's Digest*. India.
5. Mehta, Vinod. *Outlook*. India.
6. Pearlstine, Norman. *Time*. Hong Kong, April 8, 2002.
7. Smith, Richard M. *Newsweek*. NewYork.

اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند اہم مطبوعات

۱۔	اقبال کی عملی اور نظری شعریات	مرتبہ: پروفیسر مسعود حسین خان
۲۔	اقبال اور مغرب	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
۳۔	اقبال اور تصوف	مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور
۴۔	خطبات اقبال پر ایک نظر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۵۔	محمد اقبال-میر سید میر شکر	مترجم: کبیر احمد جائسی
۶۔	اقبال اور قرآن	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
۷۔	اقبال کا فن	مرتبہ: پروفیسر محمد امین اندرابی
۸۔	اقبال-ایک تذکرہ	حکیم منظور
۹۔	اقبال-ایک تجزیہ	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
۱۰۔	وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
۱۱۔	نغماتِ اقبال	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
۱۲۔	اقبال کا تخلیقی شعور	پروفیسر حامدی کاشمیری
۱۳۔	تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال	مُعید الظفر
14.	Islam in the Modern World-Problems and Prospects	Prof. A. A. Saroor
15.	Some Aspects of Iqbal's Poetic Philosophy	Prof. Alam Khundmiri
16.	Iqbal's Raptures Melodize Education	Prof. Syed Habib
17.	Iqbal's Multiformity	Compiled by Dr. B.A. Nahvi

۱۸۔ اقبالیات-شمارہ نمبر ۱ تا ۱۵

اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر